www.urducouncil.nic.in

قیمت : ₹10/-

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

مارچ 2022

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
دلچسپ کہانیاں
سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین
صحتِ اطفال
بچّوں کا کتب کا خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

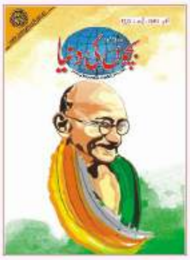

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	دختر مالیر کوٹلہ ڈاکٹر روبینہ شبنم سے گفتگو	ڈاکٹر امتیاز احمد الائی	5
شخصیت	ڈاکٹر رشید جہاں	ڈاکٹر کہکشاں عرفان	9
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		14
جہان نسواں	علامہ جمیل مظہری کا تخلیقی مزاج	ڈاکٹر نصرت جہاں	15
	تعلیم اور عورت	ڈاکٹر محمد فیروز عالم	18
	کلکتہ کی شاعرات اور ان کی شاعری	سلطان آزاد	20
	مرزا دبیر کی غزل گوئی	بشریٰ صدیقی	25
	اردو ادب میں عورت اور اس کے مسائل	ڈاکٹر نکہت امین	28
	جوش ملیح آبادی جدید مرثیے کا نقاشِ اول	نکہت زہرا	34
	'آئینۂ کشمیر' یا 'خطۂ بے نظیر کشمیر'	سارہ بتول	39
حسن سخن	ڈاکٹر ہاجرہ خاتون، شیبا کوثر، عصمت آرا		44
افسانہ	آخری کوشش	سیدہ ایمن عبدالستار	47
	پھر اس کے بعد	ڈاکٹر فاطمہ خاتون	52
باورچی خانہ	لذیذ پکوان	پاکیزہ نسرین	55
صحت	ایڑی کا درد	ڈاکٹر احسان رؤف	57
آرائش و زیبائش			59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61
خواتین خبرنامہ			62

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد:6 شمارہ:3 مارچ 2022

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی- 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

اردو زبان نے ہندی فلموں کے نغموں کو تازگی، پرکاری اور نغمگی عطا کی۔ بالی وڈ کی بہت سی ہندی فلمیں اردو نغموں کی وجہ سے کامیاب ہوئیں۔

بلبل ہند اور سروں کی ملکہ کہی جانے والی شخصیت لتا منگیشکر کی آواز نے نغموں کو وہ تاثیر بخشی جس نے دلوں کو مسحور کیا۔ ان کی آواز ہر طبقے کے لوگوں کی پسند تھی۔ فلمی نغموں کی آن بان اور شان سمجھی جانے والی لتا منگیشکر نے ہر قسم کے نغمے گائے خواہ وہ بھکتی کے ہوں یا فلمی۔

اندور میں پیدا ہونے والی لتا منگیشکر ہندوستان کی عظیم گلوکارہ تھیں۔ اپنے والد دینا ناتھ منگیشکر کی وفات کے بعد انھوں نے باقاعدہ گلوکاری کو اپنے لیے منتخب کیا۔ موسیقار غلام حیدر نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور گلوکاری میں انھوں نے وہ مقام بنایا کہ پھر پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھا۔ چاہے وہ بھارتی کلاسیکی موسیقی ہو یا ہندوستانی، بھجن کیرتن ہو یا بھکتی میں ڈوبے ہوئے نغمے ہر جگہ انھوں نے اپنی آواز سے لوگوں کے دلوں میں امنگ اور جوش پیدا کیا۔ انھوں نے سات دہائیوں تک اپنی موسیقی سے لوگوں کو متاثر کیا۔ لتا منگیشکر کے نغموں میں زندگی کی سرمستی ہے۔ فلمی نغموں کے ساتھ ساتھ غزل گائیکی میں بھی انھوں نے امتیازی نشانات ثبت کیے۔ جگجیت سنگھ اور جاوید اختر کے ساتھ غزل گائکی میں کام کیا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے گلزار صاحب کے نغموں کو بھی اپنی آواز سے وقار بخشا۔

لتا منگیشکر ان کی آواز میں سوز، ساز، تڑپ، چبھن اور کسک موجود ہے۔ ان کی آواز نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہندوستان میں بھی پسند کی گئی۔ انھوں نے کئی زبانوں میں نغمے گائے۔ اردو زبان پر ان کو مکمل عبور تھا اور استاد غلام حیدر سے انھوں نے باقاعدہ اردو زبان سیکھی تھی۔ اردو زبان کے تلفظ پر ان کو مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ الفاظ کی ادائیگی پر مکمل دسترس رکھتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو کی وجہ سے انھیں فلموں میں عروج حاصل ہوا۔ اس کے لیے وہ کے ایل سہگل، نور جہاں اور موسیقار کار نوشاد علی کی گفتگو کا بغور جائزہ لیتی تھیں جس سے انھیں اردو زبان کو سمجھنے میں مدد ملی اور تلفظ پر انھیں قدرت حاصل ہوگئی۔ انھوں نے اپنی شیریں آواز سے اردو نغموں کو وقار بخشا اور اردو زبان کی جاذبیت اور حلاوت سے متعارف کرایا۔

گائیکی کی دنیا میں ان کو بلبل ہند، سروں کی ملکہ جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی سنیما سے گو کہ وہ اب رخصت ہو چکی ہیں لیکن ان کی آواز ہمیشہ ان کی یاد دلاتی رہے گی۔ آنے والی نسلیں انھیں ایسی شخصیت کے روپ میں ہمیشہ یاد رکھیں گی جن کی مسحور کن آواز لوگوں پر جادو کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتی تھی۔ ہندوستانی گائیکی کی تاریخ میں ان کا نام ہمیشہ ذہنوں میں محفوظ رہے گا۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر امتیاز احمد الائی

دختر مالیر کوٹلہ

ڈاکٹر روبینہ شبنم سے گفتگو

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! آپ کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟

ج: میری پیدائش 8 مئی 1971 کو ہندو اکثریت والے ملک ، سکھ اکثریت والے صوبے اور مسلم اکثریت شہر مالیر کوٹلہ میں ہوئی۔ مالیر کوٹلہ کئی حوالوں سے تاریخی شہر ہے مگر ایک بات قابل ذکر ہے کہ تقسیم ملک کے وقت جب وطن عزیز خونی فسادات کی لپیٹ میں تھا تو مالیر کوٹلہ امن وآشتی کا نمونہ بن کر سامنے آیا۔

س :ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ ! اردو ادب کے معزز قارئین کو بتائیں کہ آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟

ج :میرے خاندان میں گوکہ کوئی باقاعدہ ادیب وشاعر تو نہیں ہیں مگر معیاری ادب کا ذوق وشوق تقریباً سبھی کو رہا ہے۔ میری دادی اماں کی جب تک بینائی سلامت رہی، میں نے ان کے ہاتھ میں ہمیشہ کتاب دیکھی ہیر رانجھا، یوسف زلیخا اور دوسرے پنجابی منظوم قصے ان کے سرہانے رکھے رہتے تھے ۔میرے والد صاحب کو ادب کے مطالعے کے ساتھ حفیظ جالندھری کی مثنوی ’’شاہ نامہ اسلام‘‘ کی حکایات زبانی یاد تھیں اور وہ فرصت کے اوقات میں انھیں ترنم سے پڑھا کرتے تھیں۔ امی جان کو مطالعے کا شوق بھی تھا اور ہمیشہ اپنے گلی محلے کے بچوں کو نعتیں، نظمیں اور گیت یاد کرواتے ہوئے دیکھا اور کبھی انبیاء کے قصے سناتے ہوئے دیکھا۔

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! ابتدائی زندگی اور تعلیم کے متعلق کچھ بتائیے؟

ج :یکے بود نابود۔ بات ان دنوں کی ہے جب میں ساتویں کلاس میں پڑھتی تھی ۔والد صاحب (بابو جی) عمارتی لکڑی کا کاروبار کرتے تھی۔ بڑے بھائی جان کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے ۔جبکہ دوسرے بھائی جان نے تعلیمی سلسلے کو پرائمری کے بعد ہی خیر باد کہہ دیا تھا۔ بابو جی

نے انھیں اپنے ساتھ ہی کام میں لگالیا۔ ہمارے بھائی ہم بہنوں سے بیحد محبت کرتے ہیں۔ سبھی بھائی اپنی بہنوں سے محبت کرتے ہیں مگر اتنی محبت میں نے نہیں دیکھی۔ دسویں کلاس میں اسکول میں اول پوزیشن حاصل کی تو گھر والوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اعلی تعلیم یافتہ لڑکی کے لیے اس کے برابر تعلیم یافتہ لڑکا تلاش کرنا پڑے گا جو بہت مشکل ہے مگر مطالعے کے شوق کے ساتھ پرورش پانے والی ضدی لڑکی کہاں ماننے والی تھی۔ پھر اجازت کے گیارہویں کلاس کے پرائیویٹ امتحان کے فارم بھر دئے۔ مجھے تین شرطوں پر مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ملی۔ اول یہ کہ میں اعلی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی کم پڑھے لکھے لڑکے سے شادی کرنے سے انکار نہیں کروں گی۔ دوم مجھے پڑھائی کے لیے الگ سے اخراجات نہیں دیے جائیں گے۔ سوم مجھے کالج میں داخلہ لینے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ان شرائط کے تحت میرا تعلیمی سفر شروع ہوا اور میں نے اس کے ساتھ ہی پرائیویٹ اسکول میں پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ گریجویشن میں نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ میرے نتائج دیکھ کر بابوجی کی خاموش حمایت مجھے ملتی رہی۔ مگر امی جان اور بڑے بھائی جان نے ہر سال میرا رزلٹ آنے کے بعد اگلی کلاسوں کے فارم بھرنے سے مجھے باصد اسرار روکا ضرور۔ ایم اے اردو میں میں نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ اخبار میں فوٹو کے ساتھ خبر شائع ہوئی تو بابوجی کے ساتھ سبھی کو فخر کا احساس ہوا مگر وہی برابر کے میچ کی فکر دامن گیر رہی۔

ایم اے کے دوران ہی میری شادی محمد سلیم خلجی ایڈووکیٹ (علیگ) سے ہوئی۔ شوہر اس قدر میری اعلی تعلیم کے شیدائی کہ اگر کہیں سے علمی اور ادبی خط بھی آجاتا تو اسے تمغے کی طرح اٹھائے پھرتے۔ اسی دوران دو سال کے وقفے کے بعد میں نے فارسی میں ایم اے میں یونیورسٹی ٹاپ کیا اور تحقیق کے لیے رجسٹریشن کروائی۔ وکیل صاحب کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی کہ میں بس اپنی تعلیم و تحقیق پر توجہ دوں۔ انھیں کی کوششوں کا ثمر ہے کہ میں تقسیم ہند کے بعد پنجاب کی پہلی مسلم لڑکی بنی جس نے اردو میں (2003) میں پی ایچ ڈی کی۔ تحقیقی مقالہ مکمل ہوا، ادھر خالق کائنات نے میرا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ بیٹی میری زندگی کا مرکز و محور بن گئی۔ نبیہ نور ایک سال کی تھی جس دن میرا پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں اردو لیکچرر کی پوسٹ پر تقرر ہوا۔ 2010 میرا تقرر ایسوسی ایٹ پروفیسر کے عہدے پر ہوا اور اگلے سال مجھے شعبے کے صدر کی ذمہ داری دی گئی۔ آجکل میں نواب شیر محمد خاں انسٹی ٹیوٹ (پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ) مالیر کوٹلہ میں صدرہ شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کر رہی ہوں۔

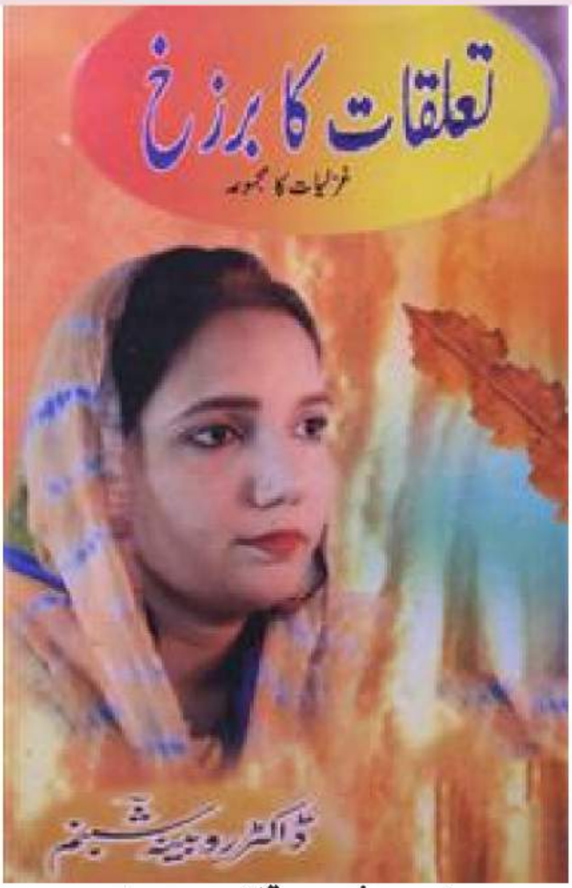

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! تخلیقی اظہار کے لیے آپ نے اردو ادب کی کس اصناف پر طبع آزمائی کی؟

ج: میں نے غزل لکھنے سے ابتداء کی تھی۔ 2006 میں غزلیات کا مجموعہ بعنوان 'تعلقات برزخ' شائع ہوا۔ اس کے بعد نظم پر بھی طبع آزمائی کی اور افسانے بھی لکھے جو بیسویں صدی، شاعر اور ایوان اردو میں شائع ہوئے۔ علاوہ ازیں تنقید پر میری چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ''اردو غزل کی ماہ تمام''، ''پروین شاکر کی نظمیہ شاعری''، ''تنقید و تجزیہ''، بشریٰ اعجاز کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ'' اور متفرق مضامین پر مشتمل ''تنقیدی مطالعے'' شامل ہیں اس کے علاوہ پنجابی سے اردو اور اردو سے پنجابی میں چند کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور گورمکھی سے شاہ مکھی میں خط کی تبدیلی بھی کی ہے۔ مادری زبان پنجابی ہونے کی وجہ سے پنجابی زبان میں شاعری کرنا تو فطری عمل ہے۔ اس کے ساتھ طلبہ کی رہنمائی کے لیے اصلاح املا کے عنوان سے کتابچہ بھی شائع ہوا ہے اور چند کتب کی تالیف کی ہے۔

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! اردو کے کس شاعر سے آپ متاثر ہوئیں ہوا اور کیوں؟

ج: زمانہ طالب علمی میں جب پہلے پہل ساحرلدھیانوی کو پڑھا تو

ان کی رومانوی شاعری نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ ساحر کی شاعری میں گریز کے انداز نے ہمیشہ مجھے اپنے سحر میں گرفتار کیا۔ ان کی شاعری میں امید اور امنگ ہے، جینے کی تمنا ہے اس لیے میں نے ساحر کو بار بار پڑھا یہاں تک کہ مجھے ساحر کا کلام حافظہ ہو گیا۔ میں ساحر لدھیانوی کی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھنا چاہتی تھی مگر میرے نگراں نے کہا کہ اس موضوع پر بہت کام ہو چکا ہے تب میں نے پروین شاکر کو تحقیق کا موضوع بنایا۔

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! آپ کے بارے میں بہت سارے ناقدین لکھتے ہیں کہ آپ پنجابی زبان کی شاعرہ ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے۔؟

ج: پنجابی میری مادری زبان ہے اور مادری زبان میں غزل گوئی فطری عمل ہے۔ پنجابی زبان میں نظمیں بھی لکھی ہیں اور میری شاعری کو جتنی پذیرائی پنجابی میں ملی اردو میں تو شاید برسوں کی کاوش سے ہی مل پائے یا پھر بھی نہ ملی۔

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ: اردو قارئین کو بتائیں کہ آپ نے پنجابی زبان میں کون کون سی کتابیں لکھی ہیں؟

ج: پنجابی میں ایک کتاب کا اردو سے ترجمہ کیا تھا 2004 میں جس کا عنوان ہے ''پیر بھیکم شاہ دیاں اسیم شلکتیاں'' یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے مگر اس کا حصہ اول ہی اشاعت پذیر ہو سکا۔ اس کے بعد پاکستان کی فکشن نگار ''بشریٰ اعجاز'' کے سفرنامے کو 2006 اردو سے پنجابی میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر جنگ سنگھ کے شعری مجموعے ''خیالاں دے پل'' کو گورمکھی رسم الخط سے شاہ مکھی رسم الخط میں تبدیل کیا اور موصوف کی ہی ایک اور ضخیم کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا، جس کا عنوان ہے ''مذاہب عالم اور نیا سائنسی دور''۔ ڈاکٹر جنگ سنگھ کے ہی شعری مجموعے کا بعنوان ''خیالوں کے سپنے'' منظوم اردو میں ترجمہ کیا۔ اپنے آبائی وطن کے متعلق ایک کتاب تالیف کی جس کا نام ہے ''مالیر کوٹلہ جان پچھان''۔

میرا پنجابی غزلیات کا مجموعہ اشاعت کے مراحل میں ہے۔ علاوہ ازیں حضرت بابا گرونانک صاحب کے حمدیہ کلام ''جپ جی صاحب'' کا اردو میں ترجمہ کیا اس کی اشاعت بھی مستقبل قریب میں ہو گی انشاءاللہ

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! آپ نے ترجمہ نگاری کا کام بھی کیا ہے آپ کے نزدیک ادبی ترجمہ کی اہمت اور مسائل کیا ہیں۔

ج: ترجمہ کی اہمت تو اسی بات سے واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دیگر زبان کے ادبی شہ پاروں تک قاری کی رسائی ترجمہ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ترجمہ نگاری ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس میں ہر دو زبانوں میں مہارت کے ساتھ ساتھ علاقائی روزمرہ اور محاورہ کے زبان پر اثرات، نیز تہذیب و ثقافت سے واقفیت نہایت ضروری ہے۔ اگر صرف زبان کی جانکاری ہو تو ترجمہ پھسپھسا اور بودا ہوتا ہے اور اس میں تخلیقی ادب پارے جیسی لطافت نہیں ہوتی۔

س: آپ تنقید کو کس نظریہ سے دیکھ رہی ہیں؟

ج: تنقید کا وجود تخلیقی ادب کے بعد آتا ہے مگر تخلیق کو پرکھنے کے لیے تنقید ہی کسوٹی ہے۔ تخلیق و تنقید ایک دوسرے کی تکمیل ہیں مگر یہ بھی نہیں کہ تنقید کے بغیر تخلیق ادھوری ہے۔

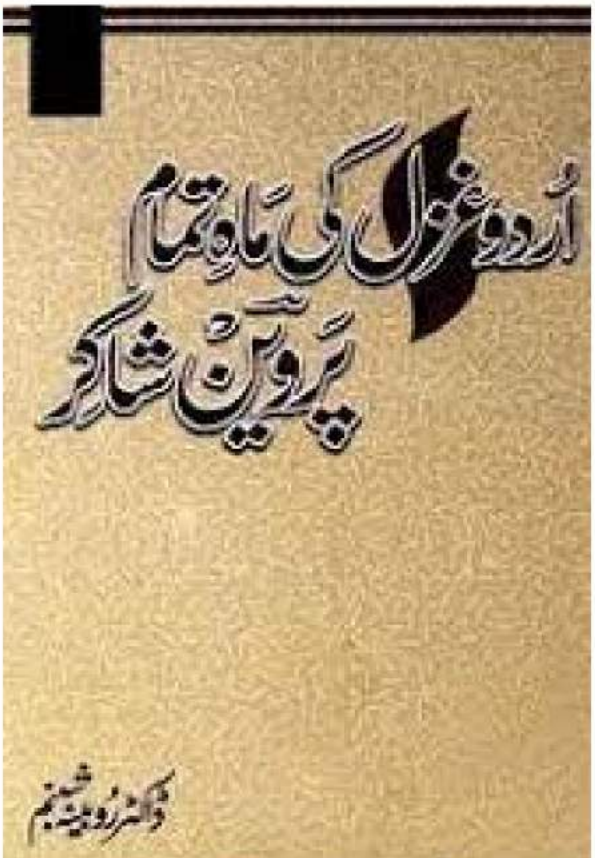

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ: پنجاب میں اردو زبان کا ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے؟

ج: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ: پنجاب میں اردو کا ماضی نہایت تابناک رہا ہے۔ تقسیم ملک کے بعد پنجاب سے گو کہ اردو کو دیس سے نکالا دیا گیا مگر محبان اردو نے اس کی محبت کو اپنے سینوں میں محفوظ رکھا اور اب جبکہ حالات سازگار ہیں تو اردو پھر سے اپنی سابقہ روش کی طرف گامزن ہے۔ مجھے امید ہے کہ جلد ہی پنجاب میں اردو اپنی اسی حیثیت کو بحال کرنے میں کامیاب ہو گی۔ اردو پنجابیوں کی محبوبہ ہے پنجابی اور اردو کے معروف

شاعر پریم وار برٹنی نے کہا کہ:

سمرپن پریم کس دے ناں کراں دل دا گرنتھ آخر

کہ جسے اردو اے محبوبہ تاں پنجابی اے ماں میری

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! تانیثی شاعری کیا ہوتی ہیں؟ تانیثی شاعری رجحان ہے یا تحریک؟

ج: ہر وہ شاعری تانیثی شاعری کہلانے کی مستحق ہے جس میں معاشرتی ،نفسیاتی اور جذباتی سطح پر صنفی امتیاز کی نشاندہی کی گئی ہو۔خواتین جیسے جیسے اپنے حقوق کے تئیں بیدار ہوتی جا رہی ہیں ویسے ویسے ان کے موضوعات میں تنوع پیدا ہو رہا ہے۔اردو ادب میں تانیثی رویہ ابھی رجحان بننے کے مراحل میں ہے، تحریک نہیں بن سکا گو کہ اس میں تحریک بننے کی گنجائش موجود ہے۔امید ہے آنے والے چند سالوں میں تانیثی شاعری اردو ادب کا ایک نمایاں موضوع ہوگی۔

س: ڈاکٹر امتیاز احمد: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! آپ کئی سالوں سے بحیثیت پروفیسر کے فرائض انجام دے رہی ہیں میرا آپ سے سوال ہے کہ ایک پروفیسر کی کیا ذمے داریاں ہوتی ہیں؟

ج: ایک پروفیسر کے تدریسی فرائض تو اس کی اولین ترجیح ہوتے ہی ہیں مگر میں سمجھتی ہوں پروفیسر خواہ کسی بھی شعبے کا ہو وہ ایک سوشل ریفارمر ہوتا ہے۔نئی نسل اس کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہے، گویا معاشرے کے مستقبل کو ڈیزائن کرنے کا اس کے پاس سنہری موقع ہوتا ہے، ویسے بھی ہر انسان والدین کے بعد سب سے زیادہ اساتذہ سے ہی متاثر ہوتا ہے۔پروفیسر کا دوسرا منصبی فریضہ تحقیق کو مثبت سمت میں آگے بڑھانا اور حاصل کردہ نتائج سے معاشرے کی تعمیر و ترقی میں تعاون کرنا مطلب اپنے افکار و کردار کے ذریعے اعلیٰ اقدار کو فروغ دینا بھی ایک پروفیسر کی ذمے داری ہے۔

س: ادب کے سلسلہ میں آپ کو کن انعامات واعزازات سے نوازا گیا؟

ج: :بہت ساری نیم سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کی جانب سے اعزاز و اکرام سے نوازا گیا۔2008 میں پنجاب سرکار کی جانب سے اسٹیٹ ایوارڈ ملا اور 2011 میں پنجاب سرکار کا ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جانے والے سب سے بڑا ایوارڈ ''شرومنی اردو ساہتکار ایوارڈ'' بھی عطا کیا گیا۔مالیر کوٹلہ کلچرل اینڈ ہیریٹیج سوسائٹی کی جانب سے ''دختر مالیر کوٹلہ'' ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

س: ڈاکٹر روبینہ شبنم صاحبہ! آپ اپنے مطبوعہ کتب کو ترتیب اور تاریخ اشاعت کے ساتھ بیان کریں؟

ج:

1۔اردو غزل کی ماہ تمام: پروین شاکر(2005)

2۔پروین شاکر کی نظمیہ شاعری: تنقید و تجزیہ(2006)

3۔بشریٰ اعجاز کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ(2006)

4۔تنقیدی مطالعے(2006)

5۔تعلقات کا برزخ(اردو غزلیات کا مجموعہ)(2006)

6۔پروین شاکر: حیات و خدمات(2017)

7۔اصلاح املا(2018)

8۔مالرکوٹلہ: جاں پچھان(2018)

ترجمہ کتب

1۔پیر بھیکم شاہ دیاں اسیم شکتیاں(2004)

2۔خیالاں دے پل(گورمکھی سے شاہ مکھی رسم الخط تبدیلی)(2012)

3۔مذاہب عالم اور نیا سائنسی دور(پنجابی سے اردو ترجمہ)(2015)

4۔خیالوں کے سپنے(پنجابی شاعری کا منظوم اردو ترجمہ)(2018)

□□□

Dr. Imtiyaz Ahmad Alie

Dooru Anantnag

Kashmir-192211 (J & K)

email. alieimtiyaz@gmail.com

ڈاکٹر کہکشاں عرفان

ڈاکٹر رشید جہاں

ڈاکٹر رشید جہاں کی علمی و عملی زندگی کی مدت صرف سینتالیس (47) سال پر مشتمل ہے۔اس قلیل مدت میں انھوں نے ترقی پسند تحریک، کمیونسٹ پارٹی اور اپنے معالج پیشے کے ذریعہ ادب انسان اور سماج کی خوب خدمات انجام دیں۔ بقول ہاجرہ بیگم وہ کہتی تھیں کہ:''دن ڈاکٹری کے لیے اور رات تحریروں کے لیے'' ڈاکٹر رشید جہاں نے جب ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو اپنی بے باک حقیقت نگاری کے ذریعہ فکشن کی دنیا میں دھوم مچادی۔

ڈاکٹر رشید جہاں کے افسانوں کی تعداد کم و بیش بیس اکیس ہے، ان کے افسانوں کے دو مجموعے منظر عام پر آئے۔ پہلا مجموعہ''عورت اور دیگر افسانے'' اور دوسرا مجموعہ''شعلۂ جوالہ''۔ان کے افسانوں میں سلمیٰ، سودا، ریل پر ایک سفر، دلی کی سیر، سڑک، پُن، استخارہ، غریبوں کا بھگوان، افطاری، مجرم کون؟ چھدا کی ماں، فیصلہ، صفر، آصف جہاں کی بہو، وہ، ساس اور بہو، چور، اندھے کی لاٹھی، وہ جل گئی، انصاف اور بے زبان شامل ہیں۔مگر ان کو شہرت کے بام عروج پر پہنچانے والے مجموعے کا نام ''انگارے'' ہے۔

'انگارے' چند ترقی پسند نوجوانوں کی ملی جلی تخلیقات کا ایک مجموعہ ہے جس سے تمام دانشورانِ ادب بخوبی واقف ہیں۔انگارے میں رشید جہاں کی ایک کہانی ''دل کی سیر'' اور ایک ڈرامہ ''پردے کے پیچھے'' شائع ہوا۔اور ان کی کہانیوں نے اردو ادب کی دنیا ہی نہیں مسلم معاشرے میں ایک آگ لگا دی۔لوگوں سے ان نوجوانوں کی بے باک حقیقت نگاری برداشت نہیں ہوئی۔انگارے کی کاپیاں حکومت نے ضبط کر لی اور ان کو آگ لگا دی گئی۔

لیکن تحقیق کے مطابق رشید جہاں کا پہلا افسانہ''سلمیٰ'' ہے جو صرف سولہ سال کی عمر میں لکھا گیا۔تب ڈاکٹر رشید جہاں صرف انٹر میڈیٹ کی طالب علم تھیں۔یہ کہانی انگریزی میں لکھی گئی تھی۔جس کو بعد میں پروفیسر آلِ احمد سرور نے اردو میں منتقل کر کے''شعلۂ جوالہ'' میں شامل

کرلیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کی خاتون اول ڈاکٹر رشید جہاں نے سولہ برس کی عمر میں ہی ادب کی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا۔ ان کی یہ کہانی معاشرے کے ریت رواج، گھریلو روایتیں، انگریزی تہذیب کی آزاد خیالی اور ہندوستانی تہذیب کے ایثار و قربانی کی مثال کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کرتی ہے۔ افسانے کی ہیروئن سلمٰی اپنے منگیتر کی خوشیوں کے لیے اپنے جذبات کا خون کرکے اس کے راستے سے ہٹ جاتی ہے اور اپنی محبت کو قربان کردیتی ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر سولہ سالہ طالب علم افسانہ نگار رشید جہاں کے پختہ ذہن اور حساس دل و دماغ کا پتہ چلتا ہے، معاشرے کے لیے دھڑکنے والا دلِ دردمند تو انھیں اپنے والدین سے ورثے میں ملا تھا، رب کائنات نے شیخ عبداللہ کے یہاں رشید جہاں جیسی حوصلہ مند قابل ذہین، حساس اور خدمت گذار بیٹی پیدا کی۔

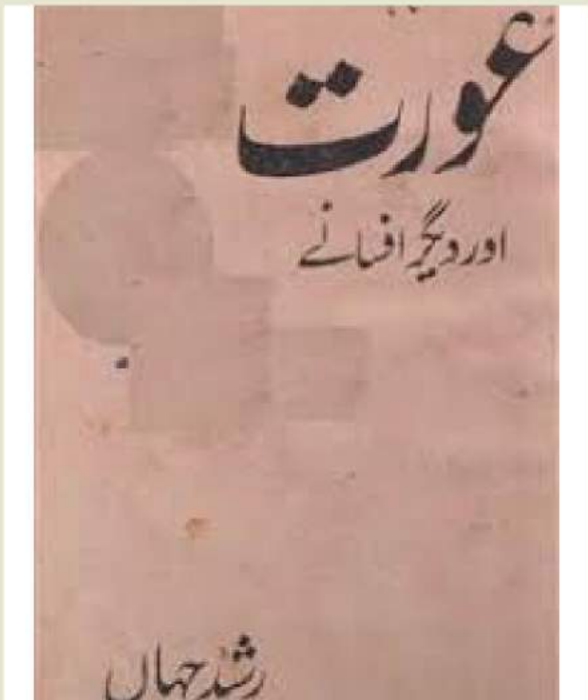

ڈاکٹر رشید جہاں کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں بے جا رومان اور آرائش و زیبائش کے بجائے ایک مقصدیت پائی جاتی ہے اور کسی نہ کسی زاویے سے ایک تلخ اور بے باک حقیقت نگاری دیکھنے اور پڑھنے کو ملتی ہے۔ یہ بے باکی صرف جنسی مسائل اور بازاری زبان تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے انگریزی تہذیب پرانی اور نئی نسل کے باہمی ٹکراؤ، مذہب کا بے جا استعمال، سماج کی ہر طرح کی برائیوں خواہ وہ جنس پرستی ہو یا چوری، ساس بہو کا روایتی جھگڑا ہو یا جھوٹا آئیڈلزم سب پر بڑے تیکھے اور بے باک انداز میں طنز کیا ہے اور بڑی بے باکی سے ایسے مسائل ایسی زبان اور کردار کو پیش کیا ہے جس کا تصور بھی ان سے پہلے کی خواتین افسانہ نگاروں نے نہیں کیا ہوگا۔ ان کا افسانہ 'سودا' ان کی بے باک حقیقت نگاری اور فن کاری کا بہترین ثبوت ہے اس مختصر سے افسانے میں رشید جہاں نے فلیش بیک کی تکنیک استعمال کی ہے اور ایک ایک لفظ کو آئینہ بنادیا ہے جس سے معاشرے کے اندرون تک کی تصاویر صاف دکھائی دیتی ہیں۔

افسانے کا آغاز تو ایک صاف ستھرا فطری عشق و محبت کے رومان پرور مکالموں سے شروع ہوتا ہے مگر اس صاف شفاف محبت کے آس پاس ایک ایسا شرمناک منظر بھی سامنے آتا ہے جو ہوس پرستی، عیاشی اور بے حیائی کی تصویر ہے، کہانی کے پہلے حصے میں جذبۂ عشق کی ترجمانی پیش کرتے ہوئے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں:

''ہم دونوں عشق کے اس خوشنما راستے پر تھے۔ جہاں ذرا ذرا سی رکاوٹیں ایک پہاڑ ایک سمندر معلوم پڑتی تھی۔ جس کا یاد کرنا بھی ایک پرلطف مصیبت ہوتا ہے تحقیق میں بھی حرکت ہے زندگی ہے لیکن اس کے بغیر زندگی کہاں؟''

اس کے بعد افسانے کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو اس طرح ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

''جانی یہاں برقع اتاردو یہاں کون بیٹھا ہے؟'' ''کیوں پیاری بوسہ دوگی؟'' ایک عورت کی آواز، ''اے ہے ہم کاہے کو ہیں تم لوگے تو ہم دیں گے۔''

ان جملوں کے ذریعہ رشید جہاں نے جنس پرستی سے معمور بازاری عورتوں اور ہوس پرستی کے نشے میں چور مردوں کی جو تصویر کھینچی ہے ان کا پیش کرنا آسان نہیں تھا۔ آگے ایک کردار یہ بتاتا ہے کہ ان تین عورتوں میں سے دو عورتیں دوسرے مردوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ ایک عورت بچ جاتی ہے اور اس کے ساتھ تین مرد اور ان تین میں عورت ایک ہے۔ اس لیے کس کے ساتھ پہلے جائے اسی کی بحث ہوتی ہے، جملے ملاحظہ فرمائیں:

''یار پہلے ہم جائیں گے، ہم نے پہلے ہی کہہ دیا تھا، ماشاء اللہ کیا کہنے آپ پہلے کیوں جائیں گے؟ یہ بھی خوب رہی۔ آپ تو وہاں مزے لو اور ہمارے .... جوش یہاں کھڑے کھڑے ختم ہوجائیں۔ ارے وہ چوتھی صاحبہ نہیں آئیں کیا ان پر وہی دستخط ہونے لگے؟ اچھا بھائی قرعہ ڈالو۔ جلدی کرو یار۔ آخر کہاں تک ضبط کیا جائے؟''

ڈاکٹر رشید جہاں کی بے باک حقیقت نگاری اور تلخ سچائیوں کے عکاس یہ جملے بھی ملاحظہ فرمائیں:

''بازار میں جب ایک کتیا کے پیچھے تین چار کتے ایک ساتھ پڑ جاتے ہیں اور اس طرح جوش اور بے تابی دکھاتے ہیں تو کمبخت کتیا بھی اتنے خریداروں کا ہجوم دیکھ کر جان چھڑا کر بھاگ جاتی ہے۔ یہ انسان عورت جس کو مالدار اور شریف مردوں نے کتیا سے بھی کمتر بنا دیا ایک ہاتھ سے کار سے ٹیک کر جھولتی رہی۔

''جانی تم ہی بتاؤ تمہارے ساتھ پہلے کون چلے؟ وہ زور سے ہنسی ارے آجاؤ میرے لیے تم سب حرامی ایک ہی سے ہو۔''

یہ کہہ کر وہ پل کی طرف بھاگی اور ایک جلدی سے اس کے پیچھے لپکا اور اس کے بعد روشنی دیکھ کر عورت کے نقاب میں منہ چھپانے کا جو عمل ہے بے حسی کی انتہا ہے، اس عملی افسانہ نگار کا ردعمل بڑا تیکھا اور تلخ ہے۔ وہ لکھتی ہیں گناہ کرنا گناہ نہیں گناہ کا پکڑا جانا گناہ ہے، اس کہانی میں جنسی مسائل اور ہوس پرستی کا جو عریاں کھیل پیش کیا گیا ہے، وہ ایک حساس قاری کی روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے، رشید جہاں کا یہ افسانہ اپنی پیش کش، زبان و بیان، منظر نگاری ہر پہلو پر کامیاب نظر آتا ہے، اس کہانی میں بے باکی اور حقیقت نگاری جا بجا موجود ہے، اور اس افسانے کا کمال ہی مصنفہ کی بے باک حقیقت نگاری ہے جو معاشرے کی تلخ حقیقتوں پر گہرا طنز کرتی ہے، شاید انگارے کے ہنگامے اور دھمکیوں نے رشید جہاں کو اور زیادہ نڈر اور بے باک بنا دیا تھا۔ انگارے میں شامل افسانہ ''دلی کی سیر'' میں تو کوئی ایسی بے باکی نہیں تھی کہ ناک اور کان کاٹنے کے فتوے دیے جاتے۔

'سودا' کہانی کے بعد بے باک حقیقت نگاری کی دوسری بہترین مثال ان کا افسانہ ''آصف جہاں کی بہو'' ہے جس میں ڈاکٹر رشید جہاں نے دائی کی زبان بڑے ماہرانہ انداز میں استعمال کی ہے۔ اس طرح کی زبان و بیان اور کردار کی بے باکی کا تصور بھی ان سے پہلے کی خواتین افسانہ نگاروں کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن یہ حوصلہ اور جرأت ترقی پسند تحریک کی خاتون اول ڈاکٹر رشید جہاں نے دکھائی۔ وہ صرف ایک بے باک افسانہ نگار اور سیاسی کارکن ہی نہیں ایک بہترین ڈاکٹر بھی تھیں، اور عورتوں کے امراض خاص طور پر ان کی نظروں کے سامنے جانے کتنے معاملے اس طرح کے گذرے ہوں گے مگر ان گذرے واقعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دینا اور سات پردوں میں چھپی ہوئی برائیوں اور کمزوریوں کو بے نقاب کرنا ہی ان کا مقصد تھا۔ خواہ وہ موضوع کتنا ہی پیچیدہ اور شرم آمیز کیوں نہ ہو، کیونکہ وہ صرف ڈاکٹر یا معالج نہیں تھیں ایک پڑھی لکھی بیدار مغز ترقی پسند فکر کی حامل بے باک اور نڈر خاتون تھیں۔

افسانہ ''آصف جہاں کی بہو'' میں اس کے عنوان سے کہیں بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کا موضوع اور پلاٹ کیا ہوگا مگر کہانی مرکزی پہلوؤں پر پہنچ کر زچہ خانے کے مسائل اور اصطلاحات، تکلیف و مصائب اور جسمانی اعضا کا وہ جس قدر بے باکی سے ضرورت کے تحت استعمال کرتے ہیں، وہ جملے، وہ مکالمے، الفاظ اور لہجہ اس کہانی کا سب سے جاندار حصہ بن گئے ہیں، زچہ خانے میں دائی اور بیگم صاحبہ کے مکالمے ان کی زبان اور لب و لہجہ اور دائی کی تیزی طراری کو بڑے فطری انداز میں پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو:

''اے ہے مسن ابھی سے نال نہ کاٹ دینا، اے بیوی کل کی بچی ہو میرے ہاتھوں کی، اب مجھی کو پڑھانے لگیں، میرا چونڈا دھوپ میں سفید ہوا ہے؟ بڑی بیگم خدا قسم یہ لڑکیاں اچھے خاصے آدمی کو الو بنا دیتی ہیں۔ میں ایسی پاگل ہوں کہ نال آنسو گرنے سے پہلے کاٹ دوں گی''۔

آگے دائی کے جلے بھنے جملے اور طنزیہ مکالمات ڈاکٹر کے لیے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

''بس میری کچھ نہ پوچھو، تم بیبیاں تو جھوٹ موٹ ہاتھ پاؤں پھلا دیتی ہو، لو جی ہوگا جب اللہ کا حکم ہوگا ہم آ کر کیا بنا لیتی، الٹے سیدھے اوزار ڈالنے شروع کر دیتی ہو۔ اور ذرا دیر ہوئی کہنے لگتی ہو کہ ہم کو بلواؤ جب یہ اجڑی میمیں نہ تھیں تو کیا کوئی عورت بچہ نہ جنتی تھی؟''

اس افسانے میں ڈاکٹر رشید جہاں نے اپنے سائنسی ذہن اور انقلابی فکر سے استفادہ کرتے ہوئے بڑی ہنر مندی سے زچہ خانے کے مسائل کو پردۂ عام پر کھینچا ہے جس میں ان کو بے باکی سے ہی کام لینا پڑا ہے، مگر حقیقت ہی اگر تلخ ہو تو لفظ و بیان سے کہاں تک پرہیز کیا جائے؟ آج بھی ہمارے ملک میں نہ جانے کتنی زچائیں صحیح نگہداشت اور میڈیکل سہولیات نہ ملنے کی وجہ سے اپنے گھر کی کوٹھری میں ہی تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ اس افسانے میں جو مسائل اٹھائے گئے ہیں اکیسویں صدی میں یہ مسائل کافی حد تک کم ہو گئے ہیں۔ اب حکومت ہند کی طرف سے زچہ اور بچہ دونوں کو بہت سی طبی امداد آئرن کی گولیاں، کیلشیم کی گولیاں، دلیہ، وغیرہ خوراک کے ساتھ مالی امداد حکومت ہند دے رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے۔ اب کفن کی بدھیا کی طرح عورتیں تڑپ تڑپ کر زچگی میں نہیں مرتیں۔

رشید جہاں نے اپنے دوسرے افسانوں میں دوسری نوعیت کے مسائل اور موضوعات بھی بڑی بے باکی سے پیش کیے ہیں جیسے غریبوں کا بھگوان، اور استخارہ، میں سماج کے فرسودہ رواج اور مذہب کی اندھی تقلید کے ساتھ اونچ نیچ اور ذات پات کے مسائل، برہمنوں اور امیر زادوں کی بے حسی کے لیے بڑی جرأت مندی اور بے باکی سے اپنے کردار ُدُرگا' کے ذریعہ نفرت کا اظہار کراتی ہیں۔ دُرگا کا سہا ہوا دل اور اس کا دماغی توازن سماج کے منھ پر ایک طمانچہ ہے۔ ان کا احتجاج صرف ہندوستانی سرمایہ داروں، سماج کے ٹھیکے داروں اور مذہب کے کٹر مولوی اور پنڈتوں کے لیے ہی نہیں بلکہ اس سے بھی دو قدم آگے جا کر بڑی دیدہ دلیری اور بے باکی سے وہ اپنے افسانے ''مجرم کون؟'' میں انگریزی حکمرانوں کے استحصال کو پیش کرتی ہیں، ڈاکٹر رشید جہاں کے اشتراکی خیالات، عمیق مشاہدات اور بے خوف حقیقت پرستی کا کھلا ثبوت ہیں بھلے ہی یہ کہانی فن کے اعتبار سے کمزور ہو مگر رشید جہاں کی بے باک حقیقت نگاری یہاں بھی عروج پر نظر آتی ہے۔

''افسانہ چھدا کی ماں''، کو پیش کر کے رشید جہاں نے اس روایت سے بغاوت کی ہے جو صدیوں سے چلی آ رہی تھی اور عورت ہوتے ہوئے بھی اپنی غلط فہمی اور بھرم کے پردے کو چاک کیا ہے۔ اس تلخ حقیقت کو افسانہ نگار نے ''چھدا کی ماں'' کے کردار کو ایک جاوید، ظالم اور بے مروت ساس کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جس کا کام اپنی بہوؤں پر ظلم ڈھانا، بہتان لگانا اور بیٹے کو بہو سے متنفر کرنا، میاں بیوی کے درمیان نفرت کے بیج بونا اور پھر اسے طلاق دلوانا۔ رشید جہاں نے اپنے افسانوں فیصلہ اور صفر میں بھی بہت اصول پرست، نڈر اور بے باک کردار پیش کیے ہیں، 'فیصلہ' میں صفیہ جو افسانے کا مرکزی کردار ہے انگریز افسروں کی بیویوں کو خوب کھری کھوٹی سناتی ہے، اور 'صفر' میں ذکیہ اصول پرست ہونے کی وجہ سے اپنے بھائی کی اشتراکی فکر سے متاثر ہوتی ہے اور اپنے والد کے بجائے اپنے بھائی کا ساتھ دینا مناسب سمجھتی ہے جب ذکیہ کے والد اپنے بیٹے کو گھر سے نکالتے ہیں تو ذکیہ اپنے والد کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور بے خوف ہو کر کہتی ہے: ''تو آپ مجھے بھی نکال دیجئے'' ذکیہ کا یہ جملہ نہایت معنی خیز اور ترقی پسند فکر کا حامل نظریہ پیش کر رہا ہے۔ ان کے کرداروں کے ذریعہ ڈاکٹر رشید جہاں کی بے باک حقیقت نگاری اور بے خوف شخصیت کا عکس نظر آتا ہے، ان کے تمام افسانوں کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر سماج کے ہر حلقے اور ہر پہلو پر اتنی گہرائی سے پڑتی ہے جیسے آفتاب کی کرنیں، صرف محلات کے دریچوں یا صحن میں ہی نہیں چھونپڑے اور اندھیری کوٹھریوں کے چھوٹے چھوٹے درازوں اور روزنوں میں بھی پہنچتی ہیں، وہ ان حلقوں میں اتر کر وہاں کی تلخیاں اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں اور ان کا انداز بیان بھی پرانی روایتوں سے انحراف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم جیسے رومانی افسانہ نگاروں سے ہٹ کر اپنی انفرادی شناخت قائم کرتی ہیں، افسانے میں رومان پرور ماحول اور فضا، لفظی آرائش و زیبائش اور محدود طرزِ فکر کے بجائے معاشرے کے مسائل، تلخ حقائق اور تجربات و مشاہدات کو حقیقت کے آئینے میں دیکھتی ہیں، اور قاری کو بھی معاشرے کا حقیقی پہلو دکھاتی ہیں وہ سابقہ خواتین افسانہ نگاروں سے کئی قدم آگے بڑھ کر معاشرے کے شرمناک عمل اور تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہیں۔ چاہے وہ افسوسناک مسائل جنس پرستی ہو، نفس پرستی ہو، بے حیائی ہو، چوری ہو، زنا ہو، رہزنی اور غریبی ہو یا پھر عدم مساوات ہو، دولت کی بہتات ہو، ان تمام مسائل پر افسانے لکھ کر اپنے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ ایک انسان ہے، اور اس کے کچھ فرائض ہیں۔

رشید جہاں کے افسانوں میں زندگی کے مسائل کی چیخیں سنائی دیتی ہیں اور ان کے کرداروں میں معاشرے کے تمام طبقات کے جیتے جاگتے حرکت کرتے لوگ نظر آتے ہیں، ان کا ہر افسانہ بے باک حقیقت نگاری کا منھ توڑ ثبوت ہے، وہ قاری کو تصورات و تخیلات کی خوبصورت وادی میں لے جانے کے بجائے حقیقت کی سنگلاخ زمین پر چلاتی ہیں، اور معاشرے میں پنپ رہے یا برسوں سے چلے آ رہے غلط رسومات، مظالم اور جرائم کا نظارہ کراتی ہیں، ان کی افسانہ نگاری صرف ادب کے اوراق تک محدود نہیں بلکہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ دینے والا سچا مقصد بھی رکھتی ہے۔ جس نے عصمت چغتائی، منٹو، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، مسرور جہاں، خدیجہ مستور وغیرہ اور بہت سارے افسانہ نگاروں کے لیے ایک مشعلِ راہ کا کام کیا۔ دخترِ ہندوستان اور ترقی پسند تحریک کی خاتونِ اول ڈاکٹر رشید جہاں نے بہت کم عمر پائی اور ان کی زندگی کئی شعبۂ حیات میں تقسیم رہی، تاہم افسانوی ادب یا فکشن نگاری میں جو بھی لکھا اور جتنا بھی لکھا وہ اپنی ہنگامیت، سماجی معنویت، حرارت اور انسان دوستی اور حقیقت نگاری کا وہ بہترین نمونہ ہے جس کی بنیاد پر ترقی پسند افسانوی ادب کی بالعموم اور خواتین افسانہ نگاروں کی بالخصوص فکشن کی عمارت کھڑی ہے۔ تبھی تو عصمت چغتائی نہایت صداقت کے ساتھ یہ اعتراف کرتی ہیں:

''غور سے اپنی کہانیوں کے بارے میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا میں نے صرف ان کی بے باکی اور صاف گوئی کو گرفت میں لیا ہے، ان کی بھرپور سماجی شخصیت میرے قابو میں نہ

آسکی۔ مجھے روتی، بسورتی اور حرام کے بچے جنتی ماتم کرتی ہوئی نسوانیت سے ہمیشہ سے نفرت تھی، خواہ مخواہ کی وفا اور جملہ خوبیاں جو مشرقی عورت کا زیور سمجھی جاتی ہیں مجھے لعنت معلوم ہوتی ہیں، جذباتیت سے مجھے ہمیشہ کوفت ہوتی ہے، عشق میں محبوب کی جان کو لاگو ہو جانا، خودکشی کرنا، واویلا کرنا، میرے مذہب میں جائز نہیں۔ یہ سب میں نے رشیدہ آپا سے سیکھا اور مجھے یقین ہے کہ رشید آپا جیسی ایک سو لڑکیوں پر بھاری پڑسکتی ہیں"۔

اور ان کی انہی خوبیوں نے پروفیسر قمر رئیس صاحب کو کچھ اس طرح متاثر کیا ہے وہ لکھتے:

"ترقی پسند ادیبوں میں پریم چند کے بعد رشید جہاں تنہا تھیں، جنھوں نے اردو میں سماجی اور انقلابی حقیقت نگاری کی روایت کو مستحکم بنانے کی کوشش کیں، اردو میں پہلی بار ایک انقلابی اور سائنسی ذہن رکھنے والی خاتون نے زندگی کو اس تاریخی اور مادری عوامل کے تناظر میں دیکھا اس لیے ان کی نظر ان پہلوؤں پر بھی گئی جن پر نہ صرف مرد بلکہ خاتون افسانہ نگاروں کی رسائی بھی نہیں ہوسکتی"۔

Dr. Kahkashan Irfan

Assistant Professor

Dr. A.H.Rizvi P.G. Degree College

Kaushambi-212206 (U.P)

Mob. 7054003555

E-mail:kahkashanadeeb4@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.. بتاریخ..

بنام National Council for Promotion of Urdu Language مسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :IFSC:CNRB0019009، A/C میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail:magazines@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

کہتے ہو تم نہ گھر مرے آیا کرے کوئی
پر دل نہ رہ سکے تو بھلا کیا کرے کوئی

زیب النساء

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے
کبھی مضطر ہے دل گاہے تپاں ہے

بسم اللہ بیگم

دل ہی کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے
تمھارے آنے کا نت انتظار رہتا ہے

جینا بیگم

شمع کی طرح کون رہ جانے
جس کے جی کو لگی ہے سو جانے

شوخ

خاک میں مل گئی ہوں جس پہ اسیر
اسی دل میں غبار ہے اپنا

امیر بیگم اسیر

خدا جانے کیا بات ہے اس میں مخفی
کہ اس ظلم پر دل کو بھاتا بہت ہے

مخفی

واہ ری نارسائی قسمت
ان کے در تک نہ ہو سکا جانا

سکندر جہاں ضیاں

جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں
ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

خفی

دشمن کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی
میرا ہی غم سنو، نہ اگر ناگوار ہو

حاتم

رونے کے لیے میرے جنازہ پہ اب عفت
جز یاس و الم کوئی بھی غمخوار نہیں

عفت

نازک دماغ وہ ہیں تو یاں بھی ہے تمکنت
ہم خود بھی ایسے ہیں کہ بنایا نہ جائے گا

فاطمہ

رقیبوں سے وہ جس دم ہنس رہے تھے روبرو میرے
مری ہر مژہ اے درد جگر موتی پروتی تھی

شوخ

کس صاحب ادا کی آمد ہوئی چمن میں
نرگس نے منہ چھپایا پتوں کے پیرہن میں

نازنین

ابرو کی جو تیرے تیغ باندھا
یہ بات تھی اک رواداری کی

گوہر

ہے موتیوں کے ہار میں پر تو نگار کا
آب گہر میں عکس بناتا ہے یار کا

حیا

یوں نرمۂ گوش اس کا لچکتا ہے گہر سے
شبنم سے لچک جاتا ہے جیسے ورق گل

عصمت دہلوی

ماخذ: تذکرہ شاعرات اردو۔ تالیف محمد جمیل احمد ایم اے بریلوی، ناشر قومی کتب خانہ بریلی

ڈاکٹر نصرت جہاں

علامہ جمیل مظہری کا تخلیقی مزاج

جوئے رواں کو کہہ لو سمندر، لیکن یہ نادانی ہے
لہریں خود بتلا گی کہ، کس میں کتنا پانی ہے

یہی بات جمیل مظہری پر بھی صادق آتی ہے کہ جمیل مظہری نے صرف غزل گوئی نہیں، نظم نگاری، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مسدس سبھی اصناف پر طبع آزمائی کی اور بہت کم ہی شعرا ایسے ملیں گے جنھوں نے ہر میدان میں اپنی ایک پہچان مقرر کی ہو لیکن اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ شاعر کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے اکثر ناقدین جذباتی ہو جاتے ہیں اور جذبات میں بہہ کر اقبال کو فلسفی منوانے پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ جمیل مظہری کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی عمل دیکھا جا رہا ہے۔ شاعر کو فلسفی بتانے والے غالباً سمجھ نہیں پاتے کہ اس طرح کے عمل سے شاعر کا ادبی قد بلند ہونے کے بجائے اس پر حرف آتا ہے۔ فلسفہ ایک جامد تصور ہے جبکہ کوئی بھی جامد تصور دامن شاعری کو تنگ کرتا ہے۔ غالب، اقبال اور جمیل کے یہاں بعض مقامات پر تشکیک، مشترک قدر کے طور پر نمایاں ہوئی ہے۔ اسی کی بنیاد پر ان شاعروں کو فلسفی شاعر کے طور پر پڑھنے اور سمجھنے کا رواج عام ہوا۔ جمیل مظہری کو بعض ناقدین نے اسی بنیاد پر فلسفی شاعر کہا ہے:

کچھ ڈھونڈ رہا ہوں میں کب سے، جب سے یہ تماشا ہے تب سے
ہر ماہ میں، ہر مہہ پارے میں، ہر سورج میں، ہر تارے میں
میخانوں میں، بت خانوں میں، دین و دانش کی دکانوں میں
افسونوں میں، افسانوں میں، ایوانوں میں محرابوں میں

واعظ کے جھوٹے وعدوں میں، شاعر کے سچے خوابوں میں
کچھ ڈھونڈ رہا ہوں میں کب سے جب سے یہ آنکھیں ہیں تب سے

☆

وہ لاکھ جھکوا لے سر کو میرے مگر یہ دل اب نہیں جھکے گا
کہ کبریائی سے بھی زیادہ مزاج نازک ہے بندگی کا

اقبال ہوں یا جمیل مظہری ، دونوں ہی شاعروں نے اپنا کوئی مخصوص نظریہ پیش کرنے کے بجائے دیگر بڑے اذہان کے نقطۂ نظر صحائف اور مطالعۂ کائنات کی حقیقت کو سمجھنے پر زور دیا ہے۔ وہ فطرت انسانی کو بہتر طور پر سمجھنا چاہتے تھے، اس لیے وہ انسانوں کے حرکت وعمل کا عمیق و وسیع مطالعہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بعض مقامات پر پیغمبرانہ صداقت در آتی ہے۔ مجنوں گورکھپوری کی یہ بات جمیل مظہری کے قد میں اضافہ کرتی ہے کہ

''انھوں نے کبھی اوسط درجے کی شاعری نہیں کی''

چونکہ جمیل مظہری کے مطالعے میں کبیر، سعدی، حافظ، خیام، میر، راسخ، آتش، غالب، انیس اور اقبال جیسی شخصیتوں کا کلام رہا ہے، اس لیے ان کے کلام میں ان شعرا کے اسالیب اور لب و لہجے کا دلکش امتزاج نظر آتا ہے۔ اس تناظر میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے خیالات کو پیش کیا جاسکتا ہے:

''ان کی نظموں میں کبیر، ٹیگور، غالب اور اقبال کے طرز فکر کا
حسین امتزاج پایا جاتا ہے''۔

(اردو ادب، 3 دسمبر، 1956 ص:105)

جمیل مظہری کی شاعری ہر چند کہ وحشت کے چشمۂ فیض میں پرورش پائی لیکن یہ سلسلہ دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ بالکل اسی طرح جس طرح داغ نے محسوس کرلیا تھا کہ شہسوار کی منزل کہیں اور ہے تو اقبال کو چند ہی غزلوں کے بعد اصلاح سے آزاد کردیا۔ جمیل مظہری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ اس لیے ان کی شاعری میں وحشت کا عکس کہیں نظر نہیں آتا۔

دراصل جمیل کی شاعری کا مطالعہ تشکیک کے دائرے میں لے جاتا ہے۔ جمیل مظہری کی ذاتی زندگی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو تشکیک کا در ان کے یہاں اپنے آبائی عقائد و نظریات سے اختلاف سے ہی ہوجاتا ہے۔ باطنی سطح پر وہ ہمیشہ اپنی ذات اور مظاہر کائنات سے نبرد آزمائی کرتے رہے۔ اپنی اسی تشکیک کو جمیل مظہری صحت مند، باعمل اور کارگر سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں تشکیک آدمی کو تجسس، جستجو، تجربہ اور لائحہ عمل پر آمادہ کرتی ہے، جس سے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے کھل جاتے ہیں، جیسے اشعار دیکھیے:

خرد انہیں سے بناتی ہے رہبری کا مزاج
یہ تجربے جو میسر ہیں گم رہی سے مجھے

صحرا کو کیا خبر کہ ہے ہر ذرۂ حقیر
مٹھی میں اپنی قسمتِ صحرا لئے ہوئے

جمیل مظہری کی بیشتر شاعری میں تصادم و آویزش کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ روحانی طور پر وہ خدا کی جستجو پر اصرار کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تخلیقی شعور کو محض روحانیت، تصوف، اخلاق، معاشرتی جبر تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔ جس طرح ٹیگور نے کسی ایک ملک کی قومیت تسلیم کرنے کے بجائے خود کو 'دنیا کا شہری' بتایا، اسی طرح جمیل مظہری نے بھی ایک خاص مذہب کی پیروی کرنے کے بجائے مختلف مذاہب کا گہرا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے شعور کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ بعض مقامات پر وہ عیسائیت کے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ گناہ ثواب کے تصور سے بالاتر ہو کر وہ صرف محبت سے مدعی نظر آتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ گناہ و ثواب یا جنت و جہنم کے تئیں خوف غالب رجحان ہے جس کے پیش نظر عبادت کو حرص و ہوس کا نتیجہ تسلیم کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ غالب کے اور اقبال کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ یہ چند اشعار دیکھیں:

یہ دیر و مسجد ہیں سب دکانیں جہاں سے چاہو خدا خریدو
جہاں بھی چاہو خودی کو بیچو ، زمانہ بازار ہے خودی کا

☆

سمجھ میں آجائے گی حقیقت خمار اُترنے دو خودی کا
حرم بھی میخانہ ہے خودی کا ، خدا بھی پیمانہ ہے خودی کا

☆

کوئی محبت اس کے وجود پر بجز ایک لفظ انا نہیں
یہ خودی کی گونج جو تجھ میں ہے، یہ کہاں سے ہے جو خدا نہیں

لیکن جب بات خودی کی آتی ہے تو اقبال کی خودی اور جمیل کی خودی دو مختلف خیال کا آئینہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

گویا اقبال کی خودی کی رسائی خدا تک ہوجاتی ہے اور عرفان نفس اور اظہار ذات آگہی کے اس درجے پر پہنچ جاتا ہے، جہاں تک رسائی ممکن نہیں۔ اس کے برعکس جمیل کی خودی کسی منظم فلسفہ و نظریۂ حیات کے بجائے محض ذاتی خیالات یا شخصی میلانات کے تحت ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ یہ دراصل خیالات کا اندرونی تضاد ہے۔

جس خودی کو اقبال آگہی کا درجہ دیتے ہیں، جمیل اسے تخیل کے پیمانے میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے فریب سے تعبیر کرتے ہیں۔

بقدر پیمانۂ تخیل سرور ہر دل میں ہے خودی کا
اگر نہ ہو یہ فریب پیہم تو دم نکل جائے آدمی کا

جمیل، اقبال کے اسرار خودی سے متاثر لیکن رموز بے خودی سے

بے خبر ہیں۔ بقول عبدالمغنی:

''جمیل، اقبال کے صرف اسرار خودی کو پیش نظر رکھتے ہیں اور ان کی تردید کرتے ہیں جبکہ رموز بے خودی سے وہ بے خبر نظر آتے ہیں یا ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور اسرار و رموز کی تطبیق نہیں کر پاتے ...... ان کے یہاں خودی و بے خودی جو کچھ ہے، سب انفرادی سطح پر اور کسی منظم فلسفہ و نظریۂ حیات کے بجائے محض ذاتی خیالات یا شخصی میلانات کے تحت ہے۔

اشعار دیکھیں:

ہستی ہے جدائی سے اس کی، جب وصل ہوا تو کچھ بھی نہیں
دریا میں نہ تھا تو قطرہ تھا، دریا میں ملا تو کچھ بھی نہیں

☆

اسی کا نام اگر محبت تو کس کو کہتے ہیں خود پرستی
ایک ایسی دنیا بنا رہا ہوں جہاں کوئی تیسرا نہیں ہے

☆

کچھ بھی نہ ملا ہاتھ کو کشکول بنا کے
یہ دست دعا کاسۂ خالی ہے خودی کا

شاعر کا تشکیکی ذہن فکری و معنوی سطح پر بلند پائے کے اشعار کہنے پر قادر ہے، جسے خیالی ناقدوں نے اقبال کے تعلق سے پیش کیا کہ ان کے یہاں نغمگی اور گداختگی سے لطف اندوز ہونا مشکل ہے جو کہ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہی خیال جمیل مظہری کے سلسلے میں بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ فیض کے افکار و نظریات محدود سہی لیکن شعری لطافت جمالیاتی احساسات کی تسکین کے لیے ان کی شاعری قاری کے نزدیک محبوبیت کا درجہ حاصل کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جمیل مظہری کا تفکیری ذہن غزلیہ روایت سے آشنا ہونے کے باوجود فکری سنجیدگی، پانی کو پانی ہی کی شکل میں دیکھنے پر معمور کرتی ہے، سبز پتوں پر نمودار شبنم کے قطروں سے حظ اُٹھانے کی طرف وہ کم کم ہی راغب ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں تک ہی ان کی نگاہ جاتی ہے۔ ان پنکھڑیوں کو پھول بنتے ہوئے دیکھتے تو ان کی شاعری میں سوز گداز کا بھی اعتراف ملتا اور لذت آفرینی میں بھی اضافہ ہوتا۔

ایسی بات نہیں کہ انھوں نے روایتی شاعری نہیں کی۔ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اختر شیرانی کی سلمیٰ، خیالی محبوبہ تھی جبکہ عذرا نے حقیقت میں جمیل مظہری کو ہجر کی لذت سے آشنا کیا تھا۔ ان کا زخم تو ناسور بن چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جمیل مظہری کے بعض اشعار قاری کو نشتر کی طرح درد آشنا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی تناظر میں چند اشعار ملاحظہ کریں:

حسن کہاں کہاں نہ تھا پھر بھی نظر جھکی رہی
اُٹھ نہ سکا جمیل سے ناز تیرے حجاب کا

کسی کا خود سہی اک نکھار دے تو دیا
خزاں کو تم نے لباس بہار دے تو دیا
امیدیں چھین لیں اس نے تو پھر گلہ کیا ہے
قرار مانگ رہے تھے قرار دے تو دیا

نظر کو پاک کیا، فکر کو بلند کیا
دلوں کو تیری محبت نے درد مند کیا

اے موسم گل تجھ سے، ہم سادہ مزاجوں نے
گل پیرہنی مانگی، خونیں کفنی پائی

جمیل مظہری مارکسی نظریات سے کہیں کہیں متاثر نظر آتے ہیں لیکن اشتراکیت سے وہ کوسوں دور رہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ترقی پسندی کے عہد میں شعرا دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ سردار جعفری کی پیروی کرنے والے شعرا نے بلند آہنگی کو ادبی سرمایہ سمجھا تو فیض کے ہم نوا شعراء نے نرم آثاری کو شاعری کا اہم جز و قرار دیا۔

بقول جوہر نظامی:

'' یہ سچ ہے کہ شاعری اندرون احساسات سے جنم لیتی ہے۔ آخر ان کے وجود کی تعمیر میں خارجی احساسات کا اپنا رول نہیں ہوتا ہے۔ جمیل مظہری اپنے عہد کے ایک بڑے شاعر تھے۔ انہوں نے جتنی عمدہ بجی سجائی اور فکر و خیال میں ڈوبی ہوئی شاعری کی ہے، ان کے ہم عصروں میں کوئی دوسرا نہیں کر سکا ''۔ (آج کل، ص:43)

المختصر جمیل مظہری کے تخلیقی مزاج کو سمجھنے کے لیے ان کا یہ شعر ہی کافی ہے۔

میں خدا کو پوجتا ہوں، میں خدا سے روٹھتا ہوں
یہ وہ نازِ بندگی ہے جسے پوچھیے خدا سے

☆

Dr. Nusrat Jahan
Associate Prof.
Dept. of Urdu
Surendranath Evening College
24/2, Mahatma Gandhi Rd, Baithakkhana,
Kolkata-700009 (West Bengal)

ڈاکٹر محمد فیروز عالم

تعلیم اور عورت

یوں تو تعلیم و تربیت کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی جاتی رہی ہے دور جدید کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی ضرورت ، اہمیت اور افادیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ آج دنیا جس برق رفتاری سے ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اس سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ دولت علم کو حاصل کرنا مردوں اور عورتوں کے لیے لازمی امر ہے۔ ترقی صرف انھیں حاصل ہوتی ہے جس کے افراد زیور علم سے آراستہ و پیراستہ ہوں۔ علم کے بغیر انسان کسی بھی کام کو کرنے سے قاصر ہے کیونکہ جب علم نہ ہوگا تو اس پر عمل درآمد کیسے ہو سکے گا۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے بھی حصول علم لازمی ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مرد و عورت دونوں کو حصول علم کی تاکید کی ہے۔ کیونکہ علم ہی کی وجہ سے انسان نے اتنی ترقی کی ہے۔ علم ہی کے ذریعہ انسان اس قابل ہوا ہے کہ وہ فطرت کے رازوں کو سمجھے اور انھیں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرے۔ علم طاقت کی مترادف ہے اور علم نیکی کا وسیلہ بھی ہے۔ جو شخص سچا علم حاصل کرتا ہے وہ سوائے نیک ہونے کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ سچا علم وہ ہے جو ہمیشہ سچ ہو اور کسی حالت میں غلط نہ ثابت ہو سکے۔ سچا علم کوئی جامد شے نہیں ہے بلکہ یہ متحرک ہوتا ہے جس سے انسان کے تخیل اور طرز عمل پر اثر پڑتا ہے۔ علم کا عملی زندگی سے قریبی تعلق ہونا چاہیے۔ کیونکہ علم دراصل انسان کے تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ مختلف تجربات ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ہمارے اعمال اور رجحانات پر اثر انداز ہوتے ہیں اور اس طرح دماغ کی نشو و نما کا سبب بنتے ہیں۔ صحیح علم وہ ہے جو انسان کو علم کے صحیح استعمال کا طریقہ بھی سکھائے۔

حصول علم کے لیے دور دراز کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے علم ایک ایسا بہتا دریا ہے جس سے جو جتنا چاہے سیراب ہو سکتا ہے لیکن محنت اور لگن شرط ہے۔ زندگی کے اقدار میں نکھار اور وقار علم سے ہی آ سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت و مرد دونوں کی اہمیت یکساں ہے۔ ترقی کی راہوں پر آگے بڑھنے کے لیے عورتوں کے لیے بھی علم اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ مردوں کے لیے ہے۔ گویا عورت اور مرد ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں جن میں سے ایک بھی علم سے لاتعلقی کائنات کے نظم کو درہم برہم کر سکتی ہے۔ خواتین کے فرائض میں سے ایک اہم فریضہ بچوں کی پرورش ان کی نگہداشت اور صحیح تربیت ہوتی ہے، بچوں کی ابتدائی درسگاہ دراصل ماں کی گود ہوتی ہے۔ اگر ماں تعلیم یافتہ اور سلیقہ شعار ہو تو اولاد بھی صاحب علم اور مہذب ہوگی۔ بچے اپنی ماں سے طور طریقے اور ہر ادب حاصل کرتے ہیں۔ ایک ماں اپنی اولاد کے خیالات کو سنوارنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ جب ماں کی بنیادیں مستحکم ہوں گی تو بچے بھی معاشرے کے اہم فرد کی حیثیت سے ابھر سکتے ہیں۔ اسی لیے اقبال نے خوب کہا ہے کہ:

''وجودزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''

ایک تعلیم یافتہ ماں ہی قوم کی اس امانت میں اخلاقی ہمدردی اور ایثار پیدا کرکے جذبہ حب الوطنی بیدار کرتی ہے۔ باپ بھی تعلیم وتربیت میں اہم کردار ادا کرتا ہے لیکن فکر معاش کی وجہ سے پورا وقت نہیں دے سکتا۔ اسی لیے بچوں کی پرورش کی حقیقی ذمہ داری ماں پر عائد ہوتی ہے۔ ماں جو ابتدائی تہذیب سکھاتی ہے۔ یہی بڑے ہوکر اس کی فطرت میں داخل ہوجاتی ہے۔ اگر صلاحیتوں اور ذہانتوں کا مقابلہ کیا جائے تو عورتیں مردوں سے کسی بھی طور پر کم نہیں ہوتیں۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اب تک کئی خواتین اقتدار سلطنت حاصل کر چکی ہیں لیکن جنھوں نے یہ کارنامے انجام دیے ہیں وہ سب تعلیم کے زیور سے آراستہ تھیں۔ صاحب عقل لوگوں کی سمجھ میں یہ بات آنی چاہیے کہ عورت کی تعلیم کو صرف قرآن مجید تک محدود رکھنا اور دیگر علوم سے دور رکھنا کوئی عقلمندی نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہوتا ہے کہ تعلیم یافتہ خواتین فیشن پرست ہوجاتی ہیں۔ فضول خرچی ان کی عادت ہوجاتی ہے اور اپنے فرائض کے انجام دہی صحیح طریقہ سے نہیں کر پاتیں۔ لیکن یہ سوچ بالکل غلط ہے کیونکہ یہ تمام عادت کسی کو گھریلو ماحول سے ملتی ہیں۔ ترقی پسند لوگوں کو اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ اگر ہم انھیں پاکیزہ اور برائیوں سے پاک ماحول میں تعلیم دیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ تعلیم نسواں معاشرے میں کسی بگاڑ کا باعث بنے۔ اسی طرح سے حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ قدرت نے عورت کو جو فطری صلاحیتیں عطا کی ہیں ان کو بروئے کار لایا جائے اسی طرح ان میں وہ مطلوبہ صفات پیدا ہوسکتی ہیں جو خوش آئند مستقبل کی ضمانت ہیں دوسری جانب عورت گھریلو زندگی کو جنت بھی بنا سکتی ہے اور جہنم بھی۔ اگر خاتون خانہ علم سے بے بہرہ ہو تو وہ کھانا، پکانا، سینا، پرونا اور دیگر امور سلیقے سے سرانجام نہیں دے سکے گی جبکہ ایک پڑھی لکھی عورت سلیقہ شعاری اور ہنرمندی سے گھریلو ذمہ داری نبھا سکتی ہے۔ اگر عورت علم الحساب اور علم معاشیات کو بالکل نہ سمجھے تو اس کے گھر کا بجٹ تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گا۔ اگر کمائی 19 ہوگی تو وہ 20 خرچ کرے گی۔ اس طرح اس کا گھریلو نظام اس کی جہالت کی وجہ سے بگڑ جائے گا۔

بحیثیت مجموعی عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا موجودہ دور میں نہایت ضروری ہے ایک تعلیم یافتہ عورت اچھے اور برے میں فرق جانتی ہے۔ اس لیے یہ خواتین کی ذمہ داری ہے کہ اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ اپنی بچیوں کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں تاکہ ہمارا آنے والا معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوسکے۔ آج کے دور میں جو سماجی مسائل سامنے آرہے ہیں خواہ وہ کسی مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں اس بات کا ثبوت ہیں کہ لوگوں کی تعلیم وتربیت میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور رہ گئی تھی انسان صحیح تعلیم کے بعد ہی انسان بنتا ہے ورنہ تعلیم اس کے لیے الزام بن کر رہ جاتی ہے۔

□□□

Dr. Md. Firoz Alam
Jaitpur
New Delhi-110044

جہانِ نسواں

سلطان آزاد

کلکتہ کی شاعرات اور ان کی شاعری

(انیسویں صدی کے حوالے سے)

تاریخ شاہد ہے کہ جب دہلی اجڑ رہی تھی تب وہاں کے ارباب کمال بشمول شعرا نے اپنی پناہ گاہ عظیم آباد، لکھنؤ اور مرشد آباد کا انتخاب کیا اور وہاں جا کر اردو شاعری کا چراغ روشن کیا۔ جس کی روشنی دور دور تک پھیلتی گئی۔ مرشد آباد کے علاوہ صوبہ بنگال میں اردو کے کئی اہم مراکز تک شعراء پھیلتے گئے۔ ان میں سب سے اہم مرکز بنگال کی دارالسلطنت، کلکتہ کو اہم مقام حاصل رہا۔ کیونکہ یہاں شعبۂ زندگی کی تمام تر سہولیات میسر تھیں۔ کلکتہ اٹھارہویں صدی سے انیسویں صدی تک اردو شعر وادب کا اہم مرکز رہا۔ اس اہم مرکز کو مزید تقویت اس وقت حاصل ہوگئی جب اس شہر سے متصل مٹیا برج کو واجد علی شاہ اختر کی سرپرستی مل گئی۔ جن کے دور میں اردو شعر وادب کا دور دور تک چرچہ ہونے لگا اور اس طرح اردو شاعری پھلنے پھولنے لگی۔

یہاں کی شعر وشاعری میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کئی اہم پردہ نشیں خواتین اور کئی اہم طوائفوں نے نسائی شاعری میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ اسے فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔

کہا جاتا ہے کہ کسی بھی ملک یا قوم کے باشندوں یا قوم کی علمی ،ادبی، فنی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی صلاحیتوں کا محاسبہ ومحاکمہ کرنے کے لئے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کے حالات کی واقفیت ضروری ہے۔ کیونکہ ہر دور میں خواتین نے بھی جہاں تمدن، معاشرت اور سیاست میں اپنا نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ وہیں اردو زبان وادب بشمول شعر وشاعری میں بھی اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے ہر عہد میں ایسی خواتین کی تعداد اور ان کے علمی کارنامے مل جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اردو کے بیشتر قدیم تذکرہ نگاروں نے ان کے ساتھ بے اعتنائی کا سلوک کیا مگر پھر بھی کچھ تذکرہ نگاروں نے اپنی فیاضی دکھائی ہے جس کے باعث اردو شعرا کے تذکروں میں تذکرہ شعرائے ہند، سخن شعرا، شمیم سخن اور تذکرۃ الخواتین میں مختصراً تذکرے ملتے ہیں۔ جبکہ مشہور تاریخ داں اور تذکرہ نگار فصیح الدین بلخی نے اپنے "تذکرہ نسوانِ ہند" (مطبوعہ 1956) میں ہر شعبۂ جات کی خواتین کے ساتھ شاعرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان تمام درج بالا تذکرو ں کی بنیاد پر پیش ہے علم وادب کے اہم مرکز کلکتہ کی شاعرات کے تذکرے اور ان کی نسائی شاعری کے نمونے جو بالترتیب درج کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

عشرت:

بیگم عشرت محل تخلص، نواب واجد علی شاہ کی بیگم تھی۔ جب مسند سے ہٹا کر واجد علی شاہ کو 1858 میں کلکتہ بھیجا گیا، ساتھ میں تھی۔ ان کا ایک شعر "مشاہیر نسواں" میں ملتا ہے:

شعلۂ حسن لگا آگ نہ دل میں میرے
یہ تو اللہ کا گھر ہے کسی دشمن کا نہیں

محبوب:

نواب واجد علی شاہ کی ایک اور بیگم محبوب محل، جوان کا تخلص بھی تھا۔ "تذکرہ سخن شعرا" سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ 1281ھ میں شہر کلکتہ میں مقیم تھیں۔ نمونہ کلام اس طرح ہے:

اٹھا سکی نہ مصیبت فراق یار میں روح
نکل گئی تن لاغر سے انتظار میں روح
ہزار مرتبہ تجھ پر سے میں فدا کرتی
اگر یہ ہوتی مرے پیارے اختیار میں روح
جو آنا ہے تجھے مدنظر تو آ ظالم
نکل نہ جائے کہیں تیرے انتظار میں روح

نہ نکلی حسرت دل ایک بھی کہ موت آئی
ہمیشہ تڑپا کی تیرے لیے مزار میں روح
نہیں ہے گور کی تنگی سے کچھ ہمیں وحشت
رہے گی بعد فنا کے بھی کوئے یار میں روح
اسی کے حکم میں ہے موت و زندگی محبوب
حقیقتاً ہے ولا دست کردگار میں روح

عالم:
تخلص عالم نواب واجد علی شاہ، اودھ کی خاص محل سے تھی۔
صاحب دیوان شاعرہ تھیں انھوں نے ایک مثنوی ''مثنوی عالم'' لکھی تھی۔
بقول 'سخن شعرا' کے تذکرہ نگار، 1281ھ میں مٹیابرج کے کلکتہ میں رہتی تھی۔ ان کے اشعار 'سخن شعرا' سے منقول ہیں:

گیسوئے خم دار اس کے رخ پہ بل کھانے لگا
سینۂ عشاق پر بس سانپ لہرانے لگا

بے قراری کیا بیاں ہو اس دل بے تاب کی
شور فغاں سے ہمارے عرش تھرانے لگا

اجاڑے دیکھئے کس کس کے آشیانے کو
یہی چمن میں ہے اب چار سو فغاں صیاد

عالم وہ طلبگار ترے ہونگے اسی دن
جب تازہ ستم اور کوئی ایجاد کرینگے

''مثنوی عالم'' کے کچھ اشعار اس طرح ہیں:

ختم قصّہ تو ہو گیا عالم
رات دن مانگ اب دعا عالم
رہے جب تک کہ مہر و مہ میں نور
مہدی دیں کا جب تلک ہو ظہور
نوجواں بادشاہ خوش اقبال
والیٔ لکھنؤ خجستہ خصال
جو کہ مشہور جان عالم ہے
رونق بوستان عالم ہے
رہے رونق فزائے خطۂ ہند
فخر ایراں بنائے خطۂ ہند

ملکہ:
انی نام، ملکہ تخلص، مسٹر بلا کیئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کلکتہ کی دختر تھی۔
بقول مؤلف، ''سخن شعرا''، 1864 کے آس پاس مشرف بہ اسلام ہوئی۔
یہ انگریز قوم کی خوش خرام سیم تن، نازک بدن لڑکی تھی جسے علم موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اپنا کلام حضرت نساخ کو بغرض اصلاح دکھاتی تھی۔ نمونہ کلام اس طرح ہیں:

ہوگئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام
میں نے نالہ جو کسی رات سر شام کیا
آہ و زاری نہیں سنتے بخدا راتوں کو
اس صنم کو ملکہ ہی نے مگر رام کیا
ہجر میں دل کو بے قراری ہے
جوش فریاد و آہ و زاری ہے
آنکھیں پتھرا کے ہوگئی ہیں سفید
کسی بت کی جو انتظاری ہے

پری:
سارہ عرف میجو نام، پری تخلص کلکتہ میں ایک یہودن تھیں جو ''گلدستہ نتیجۂ سخن'' مطبوعہ ماہ فروری 1882 کے قول کے مطابق یہ انگریزی، عربی اور اردو زبانوں سے بخوبی واقف تھیں اور اردو زبان میں بلا تکلف اشعار کہتی تھی۔ یہ شعر بطور نمونہ کلام درج ذیل ہے:

سن کے میرا قصۂ غم ہنس کے کہتا ہے وہ شوخ
ہم نہ سمجھے کچھ کہ اس قصہ کا حاصل کیا ہوا

حور:
نوروز جان نام، حور تخلص، لکھنو کی شاعرہ تھیں جو 1884 کے قریب کلکتہ میں مقیم تھیں۔ ''تذکرہ شمیم سخن'' اور ''تذکرۃ النساء'' میں بھی اس کا ذکر ہے۔ نمونہ کلام میں ایک شعر یہ ہے:

بعد میرے رحم آیا بھی تو کیا اے بے وفا
میں نے مانا قبر پر آیا تو کیا حاصل ہوا

عصمت:
عصمت، دمدم (کلکتہ) کی رہنے والی ایک پردہ نشیں شاعرہ تھیں جو محجوب کی حقیقی بہن تھیں۔ ''پیام یار'' (مطبوعہ 1893) میں عصمت کی ایک غزل شائع ہوئی تھی جس کا ایک شعر اس طرح ہے۔

مئے سے توبہ فصل گل میں زاہدا
ہائے توبہ آپ نے یہ کیا کہا

محجوب :

محجوب، عصمت کی حقیقی بہن تھیں جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے۔ یہ بھی دمدم (کلکتہ) کی رہنے والی پردہ نشیں شاعرہ تھیں۔ ان کا اصل نام امامی جان تھا۔

''پیام یار'' مطبوعہ مارچ 1893 میں ان کے یہ اشعار شائع ہوئے تھے، ملاحظہ ہو:

عاشقوں کی ذات کو اللہ نے
ناز اٹھانے کے لیے پیدا کیا
دل مرا اک دم نہیں لیتا قرار
سچ بتا تو نے ستمگر کیا کیا
مفت میں کھو بیٹھے دل کو ہاتھ سے
بیٹھے بٹھلائے یہ ہم نے کیا کیا

قمر :

قمر تخلص، حیدری بیگم نام عرف ماہ طلعت بیگم، دختر ہمایوں بیگم، مرزا قوس کی بہن اور واجد علی شاہ اودھ کی ایک محل تھی۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھیں۔ طبعاً خوش مزاج، ذہین اور ظریف الطبع تھیں شعر وشاعری کے علاوہ فن موسیقی میں بھی کافی دستگاہ رکھتی تھیں۔ بقول مؤلف سخن شعرا1281ھ میں شہر کلکتہ میں انتقال ہوا۔ انتقال سے قبل انھوں نے اپنا کلام مذکورہ تذکرہ کے لیے بھیجا تھا۔ جس کے چند اشعار بطور نمونہ کلام اس طرح ہیں۔

دل ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا
بھول کر بیٹھے ہمیں پھر نہ کبھی یاد کیا
روز وشب کرتی ہے بلبل یہ قفس میں فریاد
ہائے کیا فصل بہاری میں گلستاں چھوٹا
لے گیا قیس پہ بھی فوق تمہارا وحشی
مر کے بھی دست جنوں سے نہ گریباں چھوٹا
داغ سودا بر پہ ہے پاؤں میں زنجیر شعاع
ہے پری رو تیری الفت میں یہ حال آفتاب
گر مقابل ہو تمہارے روئے آتش رنگ کے
بدر کی صورت گھٹے ہر دم کمال آفتاب

حجاب:

حجاب تخلص، نواب بیگم عرف جعفری بیگم نام، داروغہ اعظم علی خاں کی دختر تھی۔ اعظم علی خاں غازی الدین حیدر، شاہ اودھ کے بھائی ہوتے تھے۔ حجاب کی تاریخ پیدائش 1259ھ ہے۔ مشاہیر نسواں میں ان کا خمسہ پایا جاتا ہے۔ حجاب کی آخری عمر کا حصہ کلکتہ میں گزرا۔ ان کا دیوان بھی شائع ہوا تھا جو نایاب ہے۔ ان کا مندرجہ ذیل شعر بہت مشہور تھا:

بن کے تصویر حجاب اس کا سراپا دیکھو
منہ سے بولو نہ کچھ، آنکھوں سے تماشا دیکھو

دیگر کلام

کہیں کیا اے حجاب آخر یہ دیکھا آنکھ سے ہم نے
کیا طوفاں بپا بحر سرشک چشم پرنم نے
اڑا دی نیند اس کی جب فراق یار کے غم نے
گزاری رات ساری تارے گن گن کے عالم نے

جمیلہ:

رضیہ خاتون نام، جمیلہ تخلص۔ خان بہادر مولوی یحییٰ علی رئیس کلکتہ کی صاحبزادی اور خان بہادر خدا بخش خاں، بانی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کی اہلیہ تھیں۔ ان کی تاریخ پیدائش 1868 بمقام کلکتہ ہے۔ گھریلو تعلیم میں اردو فارسی اور دینیات کی تعلیم پائی۔ ملکۂ شاعری فطری تھا۔ ابتدا میں رضیہ اور کبھی خاتون تخلص کرتی تھیں لیکن جب 1899 میں شاہ جمال الدین صاحب سے بیعت کی تو پیر کے نام کی مناسبت سے جمیلہ تخلص اختیار کیا۔ ان کی زندگی کے بیشتر اوقات عبادت و ریاضت میں گزرے۔ ان کے شعری سرمایہ میں آٹھ دیوان خدا بخش لائبریری سے شائع ہو چکے ہیں۔ انیسویں صدی کے شاعرات میں آپ کا ایک اہم مقام ہے جو ان کے شعری سرمایہ میں جلوہ گر ہے۔ ان کے دیوان میں غزلوں کے علاوہ قصیدے بھی موجود ہیں۔ داغ اور شاد عظیم آبادی سے شرف تلمذ تھا۔ روایت ہے کہ ذکر الٰہی کی حالت میں 1921 میں ان کا انتقال ہوا۔ نمونۂ کلام میں ان کے متفرق اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اپنا فردوس بریں یہ کوئے جاناں ہو گیا
کیا کروں جنت میں جا کر اپنا ساماں ہو گیا
حیرتی کیوں کر نہ ہوں طالب ترے دیدار کے
اک جھلک سی دیکھ کر آئینہ حیراں ہو گیا

اے دل زار چین لینے دے
بے اجل کوئی مر نہیں سکتا
چار سو اس کی جستجو کیسی
دشت و صحرا کی آرزو کیسی

اس سے آخر جمیلہ کیا چاہوں
دل نہیں ہے تو آرزو کیسی
کبر ونخوت سے جمیلہ مجھے کیا کام رہا
ساری مخلوق سے جب اپنے کو کمتر جانا

خاتون دل سے ہوتی ہے پیدا سب آرزو
دل ہو نہ جس کے پاس تمنا وہ کیا کرے

ان شاعرات کے علاوہ، خواتین شاعرات میں ایک طبقہ طوائفوں کا بھی ہے جو ملک کے مختلف شہروں میں اپنے پیشے کے اعتبار سے محفلوں اور مخصوص جلسوں میں رقص وسرود کار رہا ہے۔ ایسی شاعرات میں جو کلکتہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے تذکرے مختصراً درج کیے جاتے ہیں، ملاحظہ ہو:

شباب:

شباب تخلص، نام محمدی جان، پیشہ طوائف۔ کلکتہ کی رہنے والی تھیں اور بنگال کے نامور شاعر وصحافی عبدالرحیم شاہ عابد سے مشورۂ سخن لیا کرتی تھیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک زندہ تھیں۔ نمونہ کلام یہ ہے:

ہو گئی ہے زندگی آخر گناہوں میں مری
ہاتھ خالی ہے مرا زادِ سفر کچھ بھی نہیں
ان کی باتوں میں خدا کے لیے مت آنا شباب
یہ حسینان جہاں کس سے وفا کرتے ہیں

شرم:

شرم تخلص، عرف چھوٹی صاحبہ، باشندۂ لکھنؤ، مقیم کلکتہ، پیشہ طوائف بقول مولوی عبدالغفور خاں بہادر نساخ انھوں نے کلکتہ میں دیکھا ہے۔ نمونہ کلام اس طرح ہے:

مردے زندہ ہو گئے پازیب کی جھنکار سے
ہر قدم پر حشر برپا ہے تری رفتار سے
یہ کس رشکِ مہہ کا نظارہ ہوا ہے
کہ خورشید آنکھوں کا تارہ ہوا ہے

شوخ:

شوخ تخلص، مولا جان نام، وطن کانپور، پیشہ حسن فروشی، کلکتہ میں آ کر بس گئی تھیں عبدالرحیم شاہ عابد سے مشورۂ سخن لیتی تھی۔ پڑھنے کا انداز بھی دلربا تھا۔ نمونہ کلام یہ ہے:

غش مجھے آیا تو گھبرا کر یہ کہتا ہے وہ شوخ
میرے عاشق، میرے شیدا، میرے بسمل کیا ہوا

فاتحہ پڑھتے ہیں غیروں کے دکھانے کے لیے
ہائے کس ناز سے ٹھکراتے ہیں تربت میری
دل سی شئے آپ کو یوں مفت دئے دیتا ہوں
ہوں تو ناچیز، مگر دیکھئے ہمت میری

شیریں:

شیریں تخلص، شیریں جان نام، پیشہ طوائف کلکتہ آ کر بس گئی تھیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

دیر سے ہم سر جھکائے منتظر ہیں تیغ کے
دست و بازو کو ترے اس وقت قاتل کیا ہوا

رات باقی ہے ٹھہر جا ابھی جلدی ہے کیا
دل شیدا مجھے ہے تاب نہ کر وصل کی بات

صنم:

صنم تخلص، فہیمن نام، قوم پنجابن، پیشہ طوائف، ساکنہ کلکتہ۔ غلام بھیک خاں سے مشورہ سخن کرتی تھیں۔ صرف ایک ہی شعر مختلف تذکروں میں ملتا ہے۔ جو اس طرح ہے

چھاگلیں یار کی کرتی ہیں قیامت برپا
سینکڑوں بار بجاتی ہیں گجر وصل کی رات

بیگم:

بیگم تخلص، رشک محل خطاب، قوم پنجابن۔ ایک باکمال رقاصہ جو اپنے ہنر اور حسن وصورت کی بدولت واجد علی شاہ کی زوجہ بنی۔ واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ چلی آئیں اور یہیں رہ گئیں نمونہ کلام اس طرح ہے:

ہے منظور باجی ستانا تمہارا
گلہ کرتی ہے جو دگانہ تمہارا
نہ بھیجو ں گی سسرال میں تجھکو خانم
نہیں مجھکو دو بھر ہے کھانا تمہارا
مری کنگھی چوٹی کی لیتی خبر ہو
یہ احساں ہے سر پر دوگانا تمہارا

زہرہ:

زہرہ تخلص، منی جان نام۔ پیدائشی طور پر کشمیری لیکن ساری عمر کلکتہ میں گزری، پیشہ حسن فروشی۔ مولوی عبدالغفور نساخ سے مشورہ سخن لیا کرتی تھی۔ یہ اپنے وقت کی نامور شاعرہ تھیں۔ نمونہ کلام اس طرح ہے:

دیکھ کر چو رنگ دل ہے عاشق دل گیر کا
سبزہ رخسار سبزہ ہے مگر کشمیر کا
دل ہمارا درد کا پتلا بنا اے برہمن
ہے تصور دم بدم جو اس بت بے پیر کا

درد غم فراق سے شب کو ہوئی جو بے کلی
دل کی کشش کشاں کشاں اس کی گلی میں لے چلی

روتے ہیں سر پٹکتے ہیں زندگی اک عذاب ہے
جب نہ ملے وہ جان مال کیوں نہ ہو دل کو بے کلی

نازاں:

نازاں تخلص، ننھی جان نام عرف چھل بل، پیشہ طوائف، ساکنہ کلکتہ۔نمونہ اشعار یہ ہیں:

ساتھ فرقت کا مصیبت میں کسی نے نہ دیا
ہاں رفیق ایک جو نکلا تو مرا دل نکلا
پہلے اک غنچہ پژ مردہ سمجھ کر پھینکا
پھر تڑپتے ہوئے دیکھا تو مرا دل نکلا

نقاب:

نقاب تخلص، حمیدن بائی نام، پیشہ طوائف ساکنہ کلکتہ، منی بائی حجاب کلکتہ والی کی چھوٹی بہن تھی۔نمونہ کلام یہ ہے:

نقاب اس بت سے تو ملنا نہ ہرگز
وہ ظالم ہے ستائے گا ترا دل

وہ کیا منہ دکھائیں گے محشر میں مجکو
جو آنکھیں ابھی سے چرائے ہوئے ہیں

حجاب:

حجاب تخلص، منّی بائی نام، کلکتہ کی مشہور رقاصہ تھیں جو داغ دہلوی کی محبوبہ بھی کہلائی۔کہا جاتا ہے کہ اگر منی بائی حجاب خود شعر نہ کہتی تو بھی محض مثنوی ’’فریاد داغ‘‘ کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے زندہ رہتی۔لیکن حجاب خود بھی ایک اچھی شاعرہ تھی اور بنگال کے نامور شاعر عصمت اللہ ناسخ سے 1872 کے لگ بھگ وہ اصلاح سخن لیتی تھی۔نمونہ کلام اس طرح ہے:

حال حجاب قابل شرح و بیاں نہیں
آنسو نہ ٹپکے سن کے یہ وہ داستاں نہیں
وہ اور میرے گھر میں چلے آئیں خود بخود
سر پر مرے حجاب مگر آسماں نہیں

ملکہ:

ملکہ تخلص، ملکہ جان نام عرف بی بی ملکہ، قوم آرمینی۔انیسویں صدی کی مقبول شاعرہ گزری ہیں۔پہلے بنارس میں رہتی تھی۔لیکن قدر دانوں کی وجہ سے کلکتہ چلی آئی اور یہیں بس گئیں۔اپنے پیشہ رقص وسرود کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور تھی۔اس کی عشق وفریاد کی ایک داستان بنام ’’نالۂ ملکہ‘‘ جولائی 1866 میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔اس کا دیوان برٹش میوزیم لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔نمونہ کلام اس طرح ہے:

تردامنی سے اپنی نہیں غم مجھے ذرا
بحر کرم ہے جوش میں آمرز گار کا
ملکہ ہے جس کے ورد زباں نام کبریا
صدمہ نہ ہوگا اس کو لحد کے فشار کا

مختصر یہ کہ شہر کلکتہ بھی علم وادب کا اہم گہوارہ رہا ہے۔یہاں کے اردو ادب میں جہاں مردوں نے اس کی آبیاری کی، تو خواتین نے بھی اپنے محدود وسائل کے باوجود اس میں نمایاں کارکردگی پیش کی۔جیسا کہ اس مضمون میں شامل شاعرات کے فنی کارنامے اس کے بین ثبوت ہیں۔یہ صحیح ہے کہ انیسویں صدی اردو ادب کا روایت پسندی کا دور رہا ہے۔جسے کلاسیکی ادب بھی کہا جاتا ہے جو ہمارا تہذیبی وثقافتی ورثہ ہے اس کے اثرات ان شاعرات کے یہاں بھی نمایاں ہیں جن کی اہمیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ماخذ:

(1) تذکرہ شمیم سخن مؤلفہ مولوی عبدالحئی۔
(2) تذکرۃ الخواتین مؤلفہ مولوی عبدالباری آسی
(3) سخن شعراء مؤلفہ مولوی عبدالغفور نساخ۔
(4) تذکرہ نسوانِ ہند از فصیح الدین بلخی۔
(5) مثنوی فریاد داغ از داغ دہلوی۔
(6) نالۂ ملکہ از بی بی ملکہ۔
(7) دیوان جمیلہ

□□□

Sultan Azad
Pannu Lane, Gulzar Bagh
Patna-800007 (Bihar)

بشریٰ صدیقی

مرزا دبیر کی غزل گوئی

اردو کی ادبی دنیا میں مرزا دبیر کی شاعری پر جب بھی بحث کی گئی تو بیشتر ناقدین نے ان کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے ہی گفتگو کی ہے۔ اسی لیے ان کی مرثیہ نگاری کے سلسلے میں تو ہمیں بہت سارا مواد دستیاب ہوجاتا ہے لیکن جب ہم مرزا کی شاعری کے حوالے سے دوسری اصناف سخن پر ان کی طبع آزمائی کے حوالے سے مواد تلاش کرتے ہیں تو ہمیں بہت کم مواد فراہم ہو پاتا ہے۔ کیوں کہ مرزا دبیر کی مرثیہ نگاری کا قد اتنا بلند ہے کہ بھوں نے دوسری اصناف سخن میں جو طبع آزمائی کی ہے اس کی طرف ناقدین کی نگاہ بہت کم جاتی ہے۔ اس حقیقت میں ذرہ برابر بھی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ مرزا دبیر آسمان مرثیہ نگاری کے آفتاب ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مرزا دبیر کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی کے ذریعہ ہوئی۔ مرزا دبیر کی شاعری پر تحقیقی کام کرنے والے ناقدین کی آرا کو اگر سامنے رکھا جائے تو سب اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ مرزا دبیر نے اپنی شاعری کا آغاز بارہ تیرہ برس کی عمر میں کیا اور اسی عمر میں وہ میر ضمیر کی شاگردی کے حلقہ میں بھی شامل ہوگئے۔

مرزا دبیر کی طبیعت شاعری کے لیے پہلے ہی موزوں تھی اس کے بعد میر ضمیر جیسے استادفن کا شاگرد ہوجانا یہ ان کی شاعری کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ دوسری بحثوں میں الجھے بغیر سیدھے ان کی غزل گوئی کی طرف آتے ہیں۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ مرزا دبیر مرثیہ کے بہت بڑے شاعر ہیں لیکن انھوں نے بھی اپنی شاعری کا آغاز غزل سے ہی کیا ہے اور ابتدا میں انھوں نے کثرت سے غزلیں کہیں جس کے نتیجہ میں ان کی غزلوں کے تین دیوان تیار ہوگئے۔ لیکن وہ تینوں دیوان ناسازگار حالات کی نذر ہوگئے اور آج ہمیں مرزا دبیر کی چند غزلیں ہی دستیاب ہیں جن پر مرزا دبیر کے بیشتر ناقدین نے خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ یہی چند غزلیں تذکروں میں بھی پائی جاتی ہیں ان چند غزلوں کی روشنی میں ہم مرزا دبیر کی غزل گوئی کے امتیازات پر بھرپور روشنی تو نہیں ڈال سکتے لیکن ہاں غزلیہ شاعری میں ان کے رجحانات کی نشاندہی ضرور کر سکتے ہیں۔

مرزا دبیر کی غزلوں کا جائزہ لینے سے پہلے یہاں ناقدین دبیر کی

غزل گوئی سے متعلق کچھ آراء کو پیش کریں گے تا کہ ان آراء کی روشنی میں ہم صحیح نتائج اخذ کر سکیں۔ افضل حسین ثابت لکھنوی مرزا دبیر کی غزل گوئی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

''غزلیں بھی ابتدا میں مرزا صاحب نے کہیں اور کثرت سے کہیں مگر خود ہی ان کے عدم شہرت کی کوشش کی اور اس کوشش میں وہ کامیاب ہوئے مرزا صاحب کی غزلوں کے تین دیوان تھے ان میں سے ایک دو دیوان میر بادشاہ علی بقامرحوم اس زمانے میں مانگ لائے تھے جب وہ مشق سخن کرتے تھے باقی ایک یا دونوں دیوان مرزا صاحب نے تلف کر دیئے وہ دو یا ایک دیوان بھی میر بادشاہ علی صاحب کے یہاں مکان لکھنؤ شاہ گنج میں جب آگ لگی تو اور اسباب کے ساتھ جل گیا۔ آج تک مجھ کو ایک غزل بھی معتبر ذرائع سے نہیں ملی جو میں بالیقین کلام دبیر مرحوم کہہ کر ناظرین کے سامنے پیش کر سکوں۔ ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ان کہ غزلیں گائی جائیں۔'' (حیات دبیر صفحہ 85 تا 86)

مرزا دبیر کی غزلوں کے سلسلے میں کاظم علی خان اپنے مضمون ''مرزا دبیر کے بعض نادر قلمی آثار'' میں یوں رقم طراز ہیں:

''مرزا دبیر کی غزلیں ان کے ایام شباب کی یادگار ہیں۔ بعض تذکروں اور کتابوں میں مرزا صاحب کی محض چند مطبوعہ غزلیں ہی ملتی ہیں جو دبیر کے غزلیہ کلام کی کمیابی کی مظہر ہیں ـــ۔ ان مطبوعہ غزلوں کے علاوہ ایک قدیم قلمی بیاض میں مجھے مرزا دبیر کی ایک ایسی غزل بھی ملی ہے جو میری نظروں سے مطبوعہ شکل میں نہیں گزری ہے۔''

شاد عظیم آبادی نے اپنی مشہور زمانہ کتاب پیمبران سخن میں تحریر کیا ہے

''ایک دفعہ میں نے گستاخانہ غرض کیا کہ حضور (مرزا دبیر) نے غزلیں تو بہت فرمائی ہوں گی۔ ایسے متاثر ہوئے گویا میں نے کسی گناہ کو یاد دلوایا ہو۔''

(پیمبران سخن صفحہ 133)

مذکورہ آراء کی روشنی میں، ہم اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ مرزا دبیر نے غزلیں تو خاصی تعداد میں کہی ہیں لیکن وہ ان غزلوں کو مشتہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے ان کی ساری غزلیں سامنے نہیں آسکیں اور کچھ غزلیں جو آج مرزا دبیر کے نام سے کتابوں میں پائی جاتی ہیں ان کو بھی پورے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ غزلیں مرزا دبیر کی ہیں۔ اس صورت حال میں بھی ناقدین دبیر نے کچھ غزلوں کی نشاندہی کی ہے اور ان کو مرزا دبیر صاحب سے منسوب کیا ہے۔ کچھ متفرق اشعار ہیں جو مرزا صاحب سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

مرزا دبیر نے جس عہد میں غزلیں کہی ہیں اس عہد میں دبستان لکھنؤ کی شاعری میں سے تصوف کا رنگ اتر کر عشق و عاشقی کا رنگ چڑھ چکا تھا۔ اب لکھنؤ کی شاعری میں سوز و گداز کی جگہ شوخئ و شرارت کا ذکر ہونے لگا تھا۔ مشکل قافیہ، دقیق مضامین اور لفظوں کی کاریگری کا کھیل ہو رہا تھا ایسے ماحول میں دبیر کا ان سے متاثر ہونا اور ان کی غزلوں میں اس صورت حال کی چھاپ ہونا لازمی تھا۔ مرزا دبیر کی دستیاب غزلوں کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی غزلوں میں بھی وہی رجحان پایا جاتا ہے جو اس عہد کا عام رجحان تھا۔ یہ رجحان مرزا دبیر کی مشہور غزل کے کچھ اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو ذیل میں پیش کیے جا رہے ہیں ؎

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار میں
قبر بلبل کی ہے گلزار میں
قبر میں روزن مری رکھنا ضرور
مر گیا ہوں انتظار یار میں
بعد مردن میرے لاشے کو دبیر
جاکے رکھنا کوچۂ دلدار میں

یہ اشعار سہل ممتنع کی بہترین مثال ہیں اور ان شعروں میں عشق و عاشقی کے علاوہ دوسرے رجحان کی تلاش بے سود ہے۔ مرزا دبیر کا بیشتر کلام مذہبی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے لیکن ان کی غزلیں مذہبی بحثوں سے پاک ہیں۔ مرزا دبیر نے جس زمانے میں غزلیں کہی ہیں اس زمانے تک اودھ میں ایک خود مختار ریاست کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور صاحبان ریاست شعرا اور فن کاروں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی عزت افزائی کرتے تھے۔ پورے ہندوستان میں سیاسی انحطاط ہونے کے باوجود اودھ ایک ایسا علاقہ تھا جہاں عام لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم نہیں ہوا تھا وہ زمانہ دبیر کا عہد شباب تھا دبیر کے عہد شباب میں شہر لکھنؤ گلزار تھا۔ عیش باغ وجود میں آچکا تھا۔ ہر طرف باغات اور ہریالی کا چرچا تھا اس فضا کا عکس دبیر کی غزلوں میں جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً کچھ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

تل نمایاں ہے نہیں عارض جاناں کے تلے
ہے ستارا کہیں روشن مہہ تاباں کے تلے

ہم تو چھٹنے کے نہیں ہمدرداس دام سے آہ
اب تو دل چاہے پھنسازلف پریشاں کے تلے

قیس و فرہاد اور جناب دبیر
دشت اورکوہ ان کے گھر کے ہیں

وہ جوتم نے سناہے کوئے عشق
رہنے والے یہ اس نگر کے ہیں

قاصد جونامہ لے کے پھرا کوئے یار سے
رویالپٹ کے خوب ہمارے مزار سے
وا حسرتا وہی یہ تمنا تمام عمر
اک دن دبیرکہہ کے پکارایہ پیار سے

دل اس زلف کاجودیوانہ ہواہے
توپھررات سے دردشانہ ہواہے

وہ ہنس ہنس کے کل مجھ سے یوں پوچھتا تھا
تجھے کیا ہوا کیوں دیوانہ ہوا ہے

ہجر میں کس طرح سے جیتے ہم
منھ ہمیں یار کو دکھانا تھا

یاد وہ صحبتیں دلانہ دبیر
خواب تھا وہم تھا فسانہ تھا

مرزادبیر کی غزلوں کے دودوچیدہ چیدہ اشعار جوپیش کیے گئے ہیں ان میں بہت زیادہ گہرائی نہیں ہے اور نہ ان کے معنی ومفاہیم میں کوئی فلسفیانہ موشگافی کی گئی ہیں ہاں ان اشعار سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ مرزادبیر نے انتظار یار بھی کیا اور آزار مجنوں میں خود بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ ان اشعار کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دبیر کی غزلیں مذہبی رنگ سے آزاد ہیں اسی لیے ان کی غزلوں میں گلشن، پھول، گل، کلی، سرو، شمشاد، باغبان، قمری، چمن، شبنم، مرگ سوسن، پھولوں کے خرمن، آستانہ اور بلبل وغیرہ کاذکر جابجاملتا ہے۔ان الفاظ کا استعمال شاعر کے گردوپیش کے ماحول کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے اور غزل کے روایتی علائم کا نتیجہ بھی ہوسکتا ہے۔

دبیر کی بیشتر شاعری تو عشق حقیقی کی غماز ہے لیکن ان کی غزلیہ شاعری عشق مجازی کی بہترین مثال ہے۔مرزادبیر نے دوسری اصناف سخن میں جوطبع آزمائی کی ہے ان کو اگر سامنے رکھا جائے اور ان کی غزلیہ شاعری کو سامنے رکھا جائے تو اس حقیقت تک آسانی سے رسائی ہوسکتی ہے کہ دبیر کی غزلوں میں وہ امتیازی شان نظر نہیں آتی ہے جو دبیر کی پہچان ہے۔مرزادبیر کی مراثی، سلام یا رباعیات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو قاری کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں ہوگا کہ مرزادبیر نے اردو شاعری میں اپنی منزل کمال کو حاصل کرلیا تھا لیکن غزلوں میں وہ کمال کہیں نظر نہیں آتا۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ ان کی غزلیں ان کے عہد شباب کی یادگار ہیں جب ان کا ادبی شعور ابھی بالیدہ نہیں ہوا تھا اور ان کی شاعری تخلیقی پختگی سے ہمکنار نہیں ہوئی تھی اس لیے ان کی غزلوں میں ان کی نومشقی صاف نظر آتی ہے۔

اس کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرزادبیر کی غزلیہ شاعری دبستان لکھنؤ کی عشقیہ شاعری میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی کیونکہ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں الفاظ کی جادوگری، صنائع وبدائع کی جلوہ گری تو نہیں دکھائی ہے لیکن مضامین کی طرز ادائیگی اور روانی میں کوئی کمی نہیں آنے دی ہے۔مرزادبیر نے اپنے غزلیہ کلام کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رکھا ہوتا یا غزلیہ شاعری کو ترک نہ کیا ہوتا تو کوئی بعید نہیں کہ مرزادبیر بھی اردو کی غزلیہ شاعری میں بھی وہی مقام حاصل کرتے جو انھوں نے مرثیہ نگاری میں حاصل کیا ہے لیکن خود مرزادبیر نے ہی اپنی غزلیہ شاعری کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھا اور ان کی شاعری میں تخلیقی پختگی پیدا ہوئی تو انھوں نے غزلیہ کلام کہنا ترک کردیا۔

مرزادبیر نے غزل کہنا ضرور ترک کردیا لیکن اپنے شاگردوں کی غزلوں پر اصلاح ضرور کرتے تھے جس کی روشن مثال شاد عظیم آبادی کی ذات ہے کہ شاد کو شاد مرزادبیر کی شاگردی نے ہی بنایا تھا۔لیکن مرزا نے اپنا مذاق شاعری بدل لیا تھا اور مذہبی شاعری کو ہی اپنی شہرت کا ذریعہ اور سرمایہ نجات سمجھنے لگے تھے اس لیے عشق حقیقی کی لذت سے آشنا ہونے کے بعد انھوں نے عشق مجازی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔□□□

Bushra Siddiqui
101/124B, Neem Sarai
P/O Begum Sarai
Lucknow- 211011 (U.P)

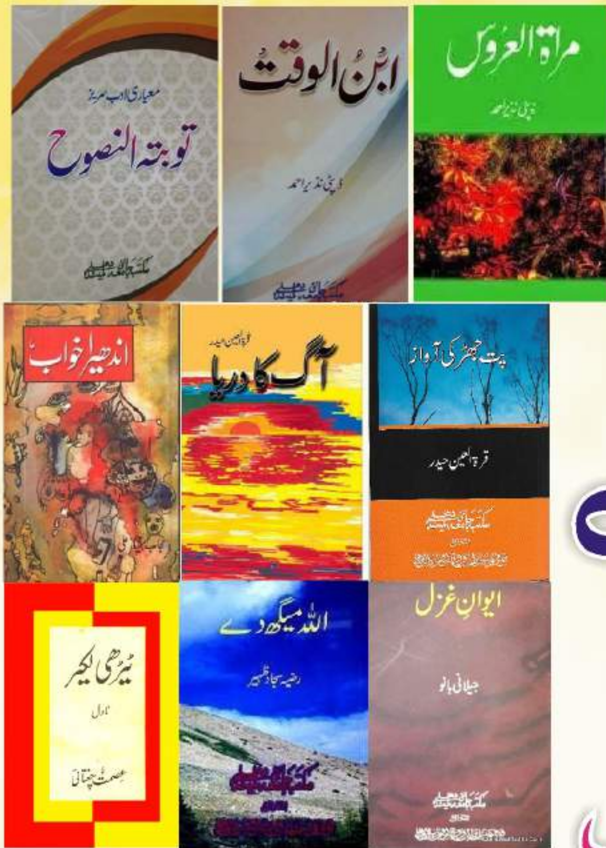

ڈاکٹر نگہت امین

اردو ادب میں عورت اور اس کے مسائل

''عورت'' اگرچہ ایک چھوٹا سا لفظ ہے لیکن اس کے معنی بہت وسیع ہے۔ ذہن میں اس لفظ کے آتے ہی ایک ایسی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے جو خالقِ کائنات کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ نے اس کے قدموں تلے جنت دی ہے۔ بچوں کی ہمدرد، بھائیوں کی غمگسار، ماں باپ کی فرمانبردار و خدمت گزار اور اپنے شوہر کی بہترین مصاحب بن کر اپنا حق ادا کرتی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر دور کے مفکروں، عالموں، ادیبوں اور شاعروں نے عورت کی عظمت کا اعتراف تو کیا ہے لیکن اس کے ساتھ جس نوع کے ظالمانہ اور جابرانہ رویے کو عرصہ دُراز سے روا رکھا گیا ہے اس کے لیے بہت کم آواز بلند کی گئی ہے۔ وہ آج بھی مصائب کا سامنا کرتی آرہی ہے، مرد کے جابرانہ تسلط کی شکار ہے اور سماجی نظام کے شکنجوں میں وہ ہنوز مقید نظر آتی ہے۔ خواتین کے تئیں موجودہ دور میں اگرچہ ایک مثبت رویہ در آنے لگا ہے اور کسی حد تک وہ خود کفیل بھی ہونے لگی ہیں۔ لیکن ایک خاص زمانے تک خواتین کے لیے معاشرے کا رویہ بے حد منفی تھا۔ معاشرے میں ان کی حیثیت صفر ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین پر نت نئے مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ ظلم و استحصال کے مختلف جابرانہ طریقے اپنائے جاتے تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ایک خاص زمانے تک خواتین کے ساتھ جس طرح کا منفی رویہ رکھا گیا، اس کی کہانی بڑی خوں آلود ہے۔ تقریباً تمام اقوام نے عورت کو ہر طرح سے مٹانے کی کوشش کی تھی۔ کبھی بچپن میں ہی اس کو زمین میں زندہ دفن کیا گیا، کبھی ماں کی کوکھ میں مار ڈالا گیا، شوہر کی موت کے بعد اسے دھرتی پر ناقابل برداشت بوجھ سمجھ کر جلتی ہوئی چِتا کے ساتھ جل کر ''ستی'' ہونا پڑتا تھا۔ گویا اس وقت مذہب اسلام (آمد رسول ﷺ کے بعد) کے علاوہ کوئی ایسی قوم یا مذہب نہیں تھا جو خواتین کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے جس کی وہ مستحق تھی۔ اس کے باوجود عورت نے کبھی لب کشائی کی جرأت نہیں کی۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ آگے چل کر بعض خواتین نے علم بغاوت بلند کر کے اپنی پستی کے اسباب جاننے کی کوشش کی، اپنے اوپر ہر دور میں کیے جانے والے ظلم و ستم کے خلاف سوال اٹھائے اور معاشرے میں اپنی حیثیت منوانے کے لیے صدائے احتجاج بلند کیا۔ خواتین کی اس روشن خیالی اور بلند ہمتی نے ادب میں بھی اپنی جگہ بنانی شروع کر دی۔ شاعر اور فکشن نگار اپنی شاعری اور فکشن میں خواتین کے مسائل اور ان پر ہو رہے مظالم کے خلاف کوشش کر کے عوام میں بیداری لانے لگے۔ اس عمل میں مرد اور عورت دونوں شریک رہے، اس کا اظہار دو صورتوں میں کیا جا سکتا ہے۔

اردو ادب میں خواتین کے مسائل کو حل کرنے کے اولین نقوش

ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں دکھائی دیتے ہیں۔انھوں نے عورتوں کی اصلاح وتربیت کو مقصدِ حیات سمجھا اوراپنے عہد کے خاندانوں میں رائج جاہلانہ رویوں کے خلاف تحریری لب کشائی کی۔'مراۃ العروس'(1869)، 'بنات النعش' (1872)،'توبۃ النصوح'(1877)، 'فسانہ مبتلا' (1885)، 'ابن الوقت'(1888) ،'ایامیٰ ،(1891)، 'رویائے صادقہ' (1892)اور'منتخب الحکایات' جیسے ناولوں کے ذریعہ مسلمانوں کے متوسط گھرانوں کی زندگی اوران کے تربیتی مسائل پرزوردیا۔علاوہ ازیں بیوہ کی شادی کا مسئلہ اورطوائف کے کردارکوبھی سلیقے سے پیش کیا۔انھوں نے خواتین کی اصلاح کرنے اوران کے حقوق کی بازیابی کے لیے مغربی طرز تعلیم کے بجائے مشرقی طرزفکرکواپنایا۔ایسے معاشرے میں جبکہ خواتین کا نہ صرف لکھنا بلکہ پڑھنا بھی شجرممنوعہ سمجھا جاتا تھا،نذیراحمد نے خواتین کوان کے حقوق اورتہذیب وشائستگی کی راہ دکھائی۔دیکھتے ہی دیکھتے خواتین پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے بھی لگیں۔بعض خواتین مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کرنے لگیں تھیں۔چنانچہ ان کی تحریریں اب رسائل میں شائع بھی ہونے لگیں تھیں۔ترنم ریاض ایک جگہ رقم طراز ہیں کہ:

''اس دورمیں خواتین ادیبوں کی تحریروں کا ایجنڈا کسی خاتون نے نہیں بلکہ ایک مرد نے تیارکیا اوروہ شخصیت ہیں ڈپٹی نذیر احمد، نذیراحمد نے مراۃالعروس میں اصغری کے کردار کے ذریعے ایک رول ماڈل تیارکیا اور یہ رول ماڈل اردوادب میں خاصی دیرتک ڈولتارہا،اصغری کا کردار،جودینی علوم کے علاوہ دنیاوی علوم تاریخ،سائنس،جغرافیہ اورجنرل نالج سے مالا مال تھا مسلمان اردوداں طبقے میں ایک ماڈل کی حیثیت سے تقریباً آدھی صدی تک مقبول رہا۔''

(خواتین اردوادب میں تانیثی رجحان،مشمولہ:شاعر،ممبئی،شمارہ:11،نومبر2003،ص34)

مسائل نسواں کے تعلق سے الطاف حسین حالی نے بھی کافی خدمات انجام دی ہیں۔ان کے دل میں خواتین کا بے حداحترام تھا،ان کی تعلیم و تربیت کی انھیں بڑی فکر رہتی تھی۔خواتین کی زبوں حالی اوران پر کیے گئے ظلم وستم کی تصویرکشی 'مجالس النساء' میں نظرآتی ہے۔وہ عورتوں کوانسانیت کا بلندترین مقام عطاکرتے ہیں۔خواتین کے مسائل کواپنی نظموں کا موضوع بناکر'چپ کی داد'اور'مناجات بیوہ' جیسی نظمیں لکھی۔

الطاف حسین حالی کی کوششوں سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ حالی سے پہلے عورت کا کوئی مقام نہ تھا۔اس کاذکرآتا بھی ہے تومحض محبوب کی حیثیت سے،وہ بھی کوئی اونچے کرداراخلاق کے حامل نہیں ہوتی بلکہ اس کی حرکتوں میں شریف عورت سے زیادہ طوائف جھلکتی ہے۔اس کی اصل صفات ایثار ،قربانی، جفاکشی،محنت،وفا، پرستش،محبت، خدمت کا کہیں ذکرنہیں ملتا۔ ماں،بہن،بیوی اوربیٹی کی حیثیت سے اس کا بلند کردار ساری دنیا کی تاریخ میں عموماًاور ہندوستان میں خصوصاً رہا ہے۔گویاانھوں نے حتی الامکان خواتین کے تئیں قدیم فرسودہ روایات کوختم کرنے کی کوشش کی۔

اسی طرح رتن ناتھ سرشار نے اپنے ناول'فسانۂ آزاد'کے کردار 'حسن آرا'اور'ثریا' کے ذریعے خواتین کی سماجی حیثیت کوپیش کیا ہے۔ناول 'کامنی'میں پہلی بارانھوں نے ایک وفادار ہندوستانی بیوی کی شکل میں ایک ہندومہذب اورسلیقہ مندعورت کی تصویرپیش کی۔عبدالحلیم شررنے بھی تاریخی ناول لکھنے کے باوجود''موہنا'' جیسا کردارتخلیق کر کے ہندوستانی عورت کا ایک خیالی تصورپیش کیا۔انھوں نے عورتوں کی اصلاح اوران کے مسائل پر معاشرتی ناول لکھے اوراپنی نت نئی کوششوں سے ایک رسالہ''دلگداز'' نکالا۔ اس کے ایک شمارے وہ میں لکھتے ہیں:

''ایک قابل قدراور پرلطف پرچہ جوعورتوں کوان کے دینی اور دنیاوی حقوق دلوائے۔ان میں تعلیم کورواج دینے،انہیں ذلت سے نکالنے اورقومی اصلاح کی قوت پیداکرنے کے لیے ماہوارشائع ہوتا ہے۔ہرنمبر میں کسی لائق ومحترم خاتون کی سوانح عمری بھی ہوتی ہے۔''

(عبدالحلیم شرر،پردۂ عصمت،مشمولہ:دلگداز،لکھنؤ:جنوری1901)

عورتوں کی آزادی اوران کی عظمت واہمیت کی مدح سرائی اکبر الہ آبادی اورعلامہ اقبال کے بعد کیفی اعظمی،اختر شیرانی،علی سردارجعفری وغیرہ نے اپنی شاعری میں دل کھول کرکی ہے۔ان شعرانے نہایت بے باکانہ،جرأت مندانہ انداز میں خواتین کے نت نئے مسائل کے لیے آوازحق بلند کی اورحقوق نسواں کے موضوع پرلکھنے کے ساتھ ساتھ خود عورت پرڈھائے گئے ظلم وستم کی مخالفت کی اورخواتین کوسماج میں برابری کا درجہ دلانے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہے۔علاوہ ازیں عورتوں کی تعلیم،ان کے مسائل اوراس صنفِ نازک پرظلم وجبر کے خلاف ایک پلیٹ فارم پرجمع ہوکرخواتین کومساوی حقوق دلانے کے لیے جدوجہد کی۔

نذرسجاد حیدر جو ملک کی تحریک آزادی سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دورکی ایک بلند پایۂ فکشن نگارخاتون تھیں۔وہ آزادی اور تعلیم نسواں کی تحریک کی ایک سرگرم رکن تھیں۔ان کی عملی جدوجہد کا واضح ثبوت اس دور میں نکلنے والے مختلف رسائل(تہذیب نسواں،خاتون، عصمت)میں شائع ہونے والے مضامین سے لگایا جاسکتا ہے۔'شہیدوفا'،

'مایوس تمنا' اور 'اختر وزہرا' ان کے مشہور افسانے ہیں۔ مضامین اور افسانوں کے علاوہ ان کے ناول بھی مسائل نسواں کی جدوجہد کا ثمرہ ہیں۔ ان میں 'اختر النساء بیگم'، 'آہ مظلوماں'، 'جاں باز'، 'نجمہ'، 'حرماں نصیب'، 'ثریا' اور 'مذہب اور عشق' شامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات حقیقت پر مبنی اور پیشکش کا انداز جذباتی ہے۔ اس طرح یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان کی تحریروں سے نسوانی شعور کی بیداری، سماجی اور تہذیبی مسائل سے آگہی حاصل ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں محمدی بیگم، مسز عباس طیب جی، عباسی بیگم، حسن بیگم، بیگم شاہنواز اور مسز عبدالقادر قابل ذکر ہیں۔ ان خواتین نے تعلیم نسواں، کم سن لڑکیوں کی شادی کے مضر اثرات اور مشرقی عورت کی روایتی وفاداری کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ ان ادیباؤں نے اپنی تحریروں کے ذریعے خواتین وحضرات دونوں کو مخاطب کیا ہے۔ بالخصوص خواتین کو تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وفادار بیوی، فرمانبردار بیٹی، ہمدرد بہن اور ایک بے مثال ماں بننے پر مائل کرتی ہیں۔ ان کی تخلیقات میں مشرقی اور مغربی اقدار کی کشمکش ملتی ہے۔ اس زمانے کی خواتین ادیباؤں اور مغرب کی ادیباؤں میں کچھ مماثلت نظر آتی ہیں۔ سماجی صورت حال متفرق ہونے کے باوجود مغرب کی تخلیق کار جہاں وکٹورین بورژوائی (صاحب ثروت) کا حصہ تھیں وہیں ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام کا جز تھیں۔ اردو کی خواتین ادیبائیں بھی مغرب کی ادیباؤں کی طرح فرضی اور قلمی ناموں سے لکھتی تھیں۔ مثلاً ہمشیرہ فلاں، دختر فلاں اور والدہ فلاں وغیرہ۔ صالحہ عابد حسین نے اپنی کئی تحریریں، ہمشیرہ غلام السیدین کے نام سے شائع کی ہیں۔

نذیر احمد کے قلم سے حقوق نسواں اور تعلیم نسواں کی ڈالی گئی بنیاد اور شیخ عبداللہ کی کوششوں سے لگایا ہوا درخت دن بدن تناور ہو رہا تھا اور 1935 تک پہنچتے پہنچتے مسائل نسواں کی آواز ملک گیر سطح پر رواں دواں تھی۔ اس دور کا ایک اہم نام ڈاکٹر رشید جہاں کا ہے جن سے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ رشید جہاں، شیخ عبداللہ کی سب سے بڑی بیٹی تھیں۔ وہ بلا کی ذہین اور روشن خیال خاتون تھیں۔ انھوں نے ابتدا سے ہی خواتین کی بے بسی ولاچاری دیکھ کر اس کے خلاف لکھنا شروع کر دیا تھا۔ 1932 میں شائع ہونے والا افسانوی مجموعہ ''انگارے'' میں شامل دو افسانے--'پردے کے پیچھے' اور 'دلی کی سیر'--ان کی بے باکی اور بہادری کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ ان میں انھوں نے پدرانہ سماج پر گہرا طنز کیا ہے۔ رشید جہاں نے مارکسزم کا گہرا مطالعہ کیا تھا، وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھیں اور انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی ممبر بن کر گھر گھر جا کر غریبی، بے بسی اور تعلیمی بدحالی کے خلاف عملی کام انجام دیے۔ غرض یہ کہ انھوں نے اپنے افسانوں، ڈراموں اور مضامین میں قومی یک جہتی، طبقاتی کشمکش اور سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی استحصال کے خلاف خوب جم کر لکھا ہے۔ علی احمد فاطمی رشید جہاں کی روشن خیالی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ''رشید جہاں کے علمی وعملی کارنامے تحریکِ نسواں اور خواتین تخلیق کاروں کے درمیان قدیم وجدید کی ایک حد قائم کرتے ہیں اور تحریک نسواں اور ترقی پسند تحریک کے مابین ایک کڑی کا رول ادا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید جہاں نہ ہوتیں تو بیدار، روشن خیال، متحرک اور سماجی حصہ دار خواتین قلم کاروں کا قافلہ کسی اور سمت مڑ گیا ہوتا۔ عصمت چغتائی کی بے باکی کو حوصلہ نہ ملا ہوتا۔''

(بحوالہ، علی احمد فاطمی، تحریک نسواں اور اردو ادب، مشمولہ: اردو ادب کو خواتین کی دین، ص 167)

یہ حقیقت ہے کہ خواتین دھیرے دھیرے ہر میدان میں آگے بڑھنے لگیں لیکن ابتدا میں انھوں نے داستانوں، افسانوں، قصوں اور کہانیوں بالخصوص ناولوں کی ترقی اور اس کی نشوونما میں ایک کلیدی رول ادا کیا ہے، بعد میں انھوں نے شعری اصناف غزل، رباعی اور نظموں کی طرف توجہ مبذول کی اور اپنی نت نئے مسائل کو سراہنے کی کوشش کی۔

رشید جہاں کے بعد خواتین کے مسائل کی سب سے زیادہ پرزور آواز اردو ادب کی ایک مشہور خاتون عصمت چغتائی (1915-1991) کی ہے۔ ان کا اندازِ تحریر، لب ولہجہ اور طرز فکر بالکل تانیثی ہے۔ انھوں نے بچپن ہی سے عورت کی محرومی، بے بسی اور لاچاری دیکھی ہے۔ اسی سبب انھوں نے پہلی بار عورت کے احساسات وجذبات اور فطرت ونفسیات کو حقیقت نگاری میں اس طرح پیش کیا ہے کہ مرد وزن دونوں محوئے حیرت ہو گئے۔ عصمت نے خواتین کو ان کی محرومی کا احساس دلایا۔ ان کا پورا ادب تانیثی حسیت اور تانیثی شعور کے اظہار کا پہلا کامیاب تجربہ ہے۔ 'ان کے لہجے کی روانی میں کوئی بناوٹ یا سجاوٹ نظر نہیں آتی۔ بلکہ ہر چیز فطری اور نارمل محسوس ہوتی ہے۔ عورت کے جذبات، کیفیات، عورت کے سماجی حالات کی عکس بندی، ان کا نفسیاتی ردعمل خواتین اردو ادب میں ایک نیا تجربہ ہیں۔' (ترنم ریاض، خواتین اردو ادب میں تانیثی رجحان، مشمولہ: شاعر، ممبئی: شمارہ: 11، نومبر 2003، ص 34)

عصمت کے ناول 'ٹیڑھی لکیر'، 'دل کی دنیا' اور 'ضدی' وغیرہ حقوقِ نسواں کے ساتھ ساتھ تانیثی شعور وادراک کی سمتوں کا پتہ دیتے ہیں۔ مزید برآں ان کے افسانے مثلاً لحاف، بے کار، یار، ننھی کی نانی، روشن اور چوتھی کا جوڑا اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ عصمت کے متعدد افسانے کلیاں، چوٹیں،

دو ہاتھ، سونے کا انڈا اور گیندا وغیرہ عام طور سے سماج کے پسماندہ طبقات کی نفسیات کو بیان کرتے ہیں۔

عصمت کے بعد رضیہ سجاد ظہیر (1905-1973) کا شمار بھی صف اول کی ادیبوں میں ہوتا ہے۔ یہ سورج آساں حقیقت ہے کہ انھوں نے طبقاتی کشمکش، سیاسی وسماجی استحصال کی عکاسی، سماج کے پس ماندہ طبقے کے دکھ سکھ بالخصوص عورتوں کی سماجی ابتری کی مخالفت کی ہے۔ ان کے ناولوں میں 'سرشام' (1953)' کانٹے' (1954) 'سمن' (1963) اور 'اللہ میگھ دے' بے حد اہم ہیں جن کے ذریعے رضیہ سجاد ظہیر مسائلِ نسواں کی آواز کو ارتفاع پر پہچانا چاہتی ہیں اور پدری سماج میں خواتین کی بہتر سے بہتر پوزیشن پر زور دیتی ہیں۔ مزید برآں وہ خواتین کے حقوق کی رہنمائی اور گھریلو تشدد کے وجوہات کو بیان کرتی ہیں۔ ان کی تخلیقات کے بارے میں صالحہ عابد حسین رقم طراز ہیں کہ:

> ''یہ ان زندگیوں کی روداد اور کہانیاں ہیں جن کو رضیہ نے بہت قریب سے دیکھا۔ ان کی سیرت کا مطالعہ کیا۔ ان کی شخصیت کو پرکھا اور ان کے درد کو محسوس کیا ہے۔ ان میں ملازمین ہیں، غریب لڑکیاں ہیں بے سہارا لڑکے ہیں، محبت کی ماری ناکام بیویاں ہیں۔''

(رضیہ سجاد ظہیر، زرد گلاب، مشمولہ: دیباچہ، صالحہ عابد حسین، دہلی: نیو پبلک پریس 1 198ء، ص21)

عورت کو ہر میدان میں سرگرم، فعال، ظلم وستم سے ماورا دکھانے کی کوشش جمیلہ ہاشمی (1929-1988) بھی اپنی تحریروں میں کرتی نظر آتی ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے مساوی حقوق کی حمایت میں آواز بلند کی اور صدیوں سے چلی آرہی مردانہ بالادستی کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ 'تلاش بہاراں'، 'دشت سوس' اور 'چہرہ بہ چہرہ روبہ رو' جیسے ناول لکھے۔ وہ اپنی ان تمام کہانیوں میں ہندوستانی عورت کی زندگی کے المناک پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین کو اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے جدوجہد کرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ بالخصوص ناول ''تلاش بہاراں'' میں جمیلہ ہاشمی اپنے دور کی مظلوم عورت کو سماج و معاشرے میں مرد کی طرح سبھی حقوق دلانے پر صدائے احتجاج بلند کرتی ہیں اور وہ مرد کے اس صدیوں پرانے جمود میں بدلاؤ لانا چاہتی ہیں، ساتھ ہی ساتھ اس بات پر زور دیتی ہیں کہ ایک اچھے معاشرے کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جب معاشرے میں مردوں کے برابر خواتین کو بھی حقوق حاصل ہوں گے اور ان کے تمام مسائل کو سلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔ ''تلاش بہاراں'' کے مرکزی کردار ''ٹھاکر کماری'' کے ذریعہ جمیلہ ہاشمی اپنے خیالات کو اس طرح پیش کرتی ہیں:

> ''آپ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں عورت کو قید رہنا چاہئے۔ اسے گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہئے آپ کیوں ہر عورت کے سینے میں اس نیکی اور بلندی کو سلا کر وہاں ایک دبی دبی سہمی سہمی مظلوم اور بے کس ہستی پیدا کررہے ہیں جو بولے تو آپ کی زبان سے، دیکھے تو آپ کی آنکھوں سے، چلے تو آپ کے کندھے پر بوجھ ڈال کر۔ اس گونگی، بہری اور اندھی مخلوق کے بجائے اسے تندرست اور روشن دل و دماغ کی حامل ساتھی کیوں پیدا نہیں کرتے ہیں۔''

(جمیلہ ہاشمی، تلاش بہاراں، راجدھانی پبلشرز، علی گڑھ، 1961ء، ص127)

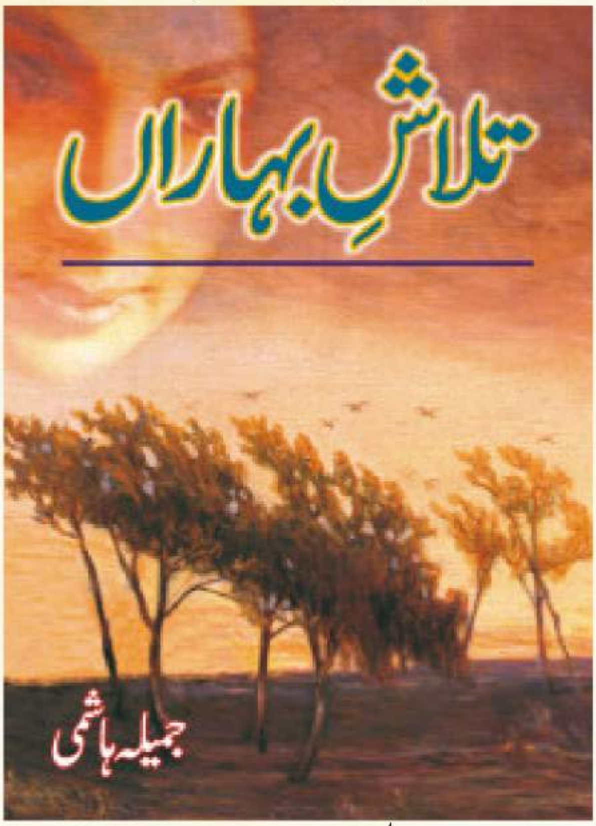

اسی طرح قرۃ العین حیدر (2007-1926) کی تمام تخلیقات میں خواتین کی پوری تاریخ نظر آتی ہے۔ انھوں نے عورتوں کے مسائل، اس کی لاچاری اور اس کے ساتھ کیے گئے جبر و استحصال کو اپنے ناولوں اور افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور عورت ذات کو مختلف نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا افسانہ ''پت جھڑ کی آواز'' خواتین کی بے بسی اور لاچاری کو بیان کرتا ہے۔ ان کے ناولوں میں سب سے زیادہ تانیثی حسیت ''آگ کا دریا'' میں نظر آتی ہے، ''اگلے جنم موہے بیٹیا نہ کیجو'' اسی شے کی غمازی کرتا ہے مزید برآں ''یاد کی ایک دھنک جلے'' اسی قبیل کا ناول ہے۔

''یاد کی ایک دھنک جلے'' میں عورت کی جرأت و ہمت کے بارے میں قرۃ العین حیدر لکھتی ہیں کہ:

''ذرا عورت کی ہمت دیکھئے یہ معاشرے کی تخلیق اور پرداخت کی ذمہ داری سنبھالتی ہے۔ جب یہ دلہن بنتی ہے تو اسے ہزار برس کی نیوا کہا جاتا ہے۔ یہ موت کے منہ میں جا کر ایک نئی زندگی دنیا میں لاتی ہے، یہ تکلیفیں اٹھاتی ہیں۔ افلاس اور تنگ دستی کا مطالبہ کرتی ہیں۔ شوہر کی بے وفائی کا سامنا کرتی ہیں۔ سوت کا جلاپا سہتی ہیں پھر بھی نیک امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتیں۔''

(قرۃ العین حیدر، یاد کی ایک دھنک جلے، ص 136)

اسی طرح خدیجہ مستور (1982-1927) نے جب ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو اس وقت فکشن کی دنیا میں مردوں کا ہی دبدبہ تھا۔ لہٰذا انھوں نے مسائل نسواں کے لیے بڑی انتہائی نرم اور سبک و مدھم آواز میں تانیثیت کی وکالت کی اور عورتوں کے احساسات و جذبات، نفسیات اور ان کے مسائل کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ 'آنگن' (1962) اور 'زمین' (1984) ان کے شاہکار ناول ہیں۔ ''آنگن'' عورتوں پر ظلم و ستم اور ان کے حقوق کی پامالی اور خواتین کے صبر و شکر کی داستان لیے ہوئے ہے اور مردوں کی عائد کردہ قدغنوں کے حصار کو توڑنا چاہتی ہیں۔ 'کھیل'، 'بوچھار' اور 'چند روز اور' جیسے مشہور افسانوں میں بھی ان کا پسندیدہ موضوع خواتین کی حیثیت، نفسیات اور مسائل کو اجاگر کرتا ہے۔

خواتین کے مسائل کو سلجھانے کی ایک منفرد آواز جیلانی بانو (1936) کی ہے۔ جن کے دل میں طبقاتی استحصال کی مخالفت، غریب، پسماندہ اور لاچار لوگوں کے لیے ہمدردی کا مادہ ہے۔ انھوں نے اپنے ناولوں اور افسانوں میں سماج کی اقتصادی نابرابریوں اور طبقاتی کشمکش کا ذکر کیا ہے۔ بالخصوص خواتین کے استحصال اور پدرانہ سماج کی زیادتیوں کو پیش کیا ہے۔ 'ایوانِ غزل' (1977) اور 'بارش سنگ' (1985) جیسے ناولوں میں جیلانی بانو نے عورت کو ایک الگ مخلوق سمجھنے کے بجائے اس مرد اساس معاشرے میں عام انسانوں کا ہی ایک حصہ تسلیم کیا ہے۔ ان کا افسانہ ''اڈّو'' خواتین کی مظلومیت کو بیان کرتا ہے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے 'روشنی کے مینار'، 'پرایا گھر'، 'نروان' اور 'روز کا قصہ' اہم افسانوی مجموعوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیلانی بانو نے اپنی تخلیقات میں حیدر آباد کی معاشرتی قدروں کو اجاگر کیا ہے۔

حجاب امتیاز علی (1908-1999) کی کہانیاں ایک نئے موڑ کی نشاندہی کرتی ہیں جو رومانیت سے تعلق رکھتی ہیں اور جن میں اعلیٰ متوسط طبقہ کی معاشرتی زندگی کی بھی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے ناول 'ظالم محبت'، 'میری ناتمام محبت' اور 'اندھرا خواب' میں مسئلہ معاشرہ، اس کی اقدار اور شادی بیاہ کے مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی تحریرات رومانوی ہونے کے باوجود مسائلِ نسواں کا ایک اہم حصہ ہیں۔ حجاب امتیاز علی کے بارے میں قرۃ العین حیدر رقم طراز ہیں کہ:

اردو فکشن میں حجاب امتیاز علی کو وہی اہمیت حاصل تھی، جو فوراً بعد کے دور میں عصمت چغتائی کو ملی اور یہ دونوں خواتین صاحب طرز اور منفرد افسانہ نگار تھیں۔ گو دونوں کے یہاں زندگی کے رویہ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد تھے۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی تاریخ مرتب کرنے والوں کے لیے یہ دونوں خواتین دو اہم ادوار کی ترجمانی اور نمائندگی کرتی ہیں اور دونوں کے مطالعے کے بغیر اردو فکشن کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔''

(انٹرنیٹ، حجاب امتیاز علی، آزاد دائرۃ المعارف، ویکی پیڈیا)

اردو ادب میں تانیثی رجحان کا سلسلہ مذکورہ بالا خواتین پر ہی ختم نہیں ہوا بلکہ دیگر خواتین نے بھی اردو ناول اور اردو افسانے میں مسائل نسواں اور حقوق نسواں کی بات کی ہے۔ ان میں بانو قدسیہ ایک معتبر ناول نگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کا ناول ''راجہ گدھ'' (1981) عورتوں کے حقوق اور ان کے مسائل کے لحاظ سے کافی مشہور ہے۔ اسی طرح واجدہ تبسم نے بھی خواتین کے احساسات و نظریات کو بالخصوص جنسی میلان کے آزادانہ اظہار کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے عورت کی نفسیات اور اس کے احساسات و جذبات کو جس بے باکی سے اجاگر کیا ہے اس زمانے میں عصمت چغتائی کے بعد واجدہ تبسم کا نام لیا جاتا ہے۔ ان کے ناول ''نتھ کی عزت'' اور ''کیسے کاٹوں رین اندھیری'' بہت معروف ہیں۔ رضیہ فصیح احمد نے بھی ''آبلہ پا'' اور ''انتظار موسم گل'' جیسے ناولوں کو خواتین کے شعور و ادراک کے زمرے میں لکھا ہے۔ علاوہ ازیں رضیہ بٹ جو عصمت چغتائی سے متاثر نظر آتی ہیں ان کا ناول ''فاصلے'' سماجی اور نفسیاتی مسائل کو بیان کرتا ہے۔ بشریٰ رحمٰن کی تخلیقات میں حقوق نسواں کے مسائل پر خوب تفصیلات ملتی ہیں۔ ان کے ناول ''عشق عشق'' میں پدرانہ سماج میں عورت کی مسخ شدہ صورت حال کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ترنم ریاض اردو ادب میں ایک معتبر اور انقلاب پسند خاتون کا درجہ رکھتی ہیں۔ عورت کے مسائل اور اس کی نفسیات پر ترنم ریاض نے خوب لکھا ہے۔

خواتین اردو شاعرات میں جو خاص اہمیت وشہرت کی حامل نظر آتی ہیں ان میں ادا جعفری، شفیق فاطمہ شعریٰ، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، سلطانہ مہر، بلقیس ظفر الحسین شاہدہ، عذرا پروین، شہناز نبی، ترنم ریاض اور عذرا عباس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان خواتین میں سب سے اہم نام کشور ناہید کا ہے۔وہ شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ حقوقِ نسواں کی تحریک کی حامی بھی ہیں۔اسی طرح فہمیدہ ریاض نے پہلی بار شادی شدہ عورت کے انتہائی نازک ترین احساسات وجذبات کو پیش کیا ہے۔بلقیس ظفیر الحسن نے مردوں کو اپنے حقوق منوانے کے خاطر یہ باور کرایا ہے کہ وہ بھی خدا کی مخلوق ہے۔اسے بھی جینے کا حق ہے جیسے کہ تم جیتے ہو۔

دوسری شاعرات نے بھی اپنی محرومیوں اور ناپسندگیوں کو شعری زبان دے کر اپنی تنہائی اور بے چارگی کا حوالہ دیا ہے۔ان شاعرات نے جہاں رفاقتوں میں درد کو محسوس کیا وہیں ان کے باطن سے چیخ وپکار کی گونج بھی سنائی دینے لگی۔اسی طرح پروین شاکر کی ترجیحات عورت کی آزادی، قید وبند کی صعوبتوں سے رہائی اور اپنے طور وطریقے سے زندگی جینے اور فکر کرنے پر منحصر ہے۔

مزید برآں وہ شاعرات جنھوں نے ذاتی تجربات کے مطالبات کا احترام کرتے ہوئے حیات وکائنات کے دیگر مسائل وموضوعات پر اپنے فن کی بنیاد رکھی، ان میں عرفانہ عزیز، شائستہ حبیب، نسرین انجم بھٹی، ماہ طلعت زاہدی اور عذرا عباس اہمیت کی حامل نظر آتی ہیں۔اسی طرح ادا جعفری نے نئی تعبیرات اور نئی معنویتوں سے اپنا تخلیقی رشتہ استوار کیا ۔انھوں نے خواتین کو خوداعتمادی اور خودشناسی سے آگاہ کیا ہے:

میں تو خود خالق و کوزہ گر و صناع بنی
شہر بانو بھی میرا نام رہا مریم بھی
عمر بھر ذہن کے گمنام جزیروں میں رہی
بیگناہوں کی طرح میں بھی اسیروں میں رہی
میرے قدموں تلے جنت ہوئی تعمیر مگر
میری قسمت تیرے ہاتھوں کی لکیروں میں رہی
حرف آغا بھی میں نقطۂ انجام بھی ہے
کل کی امید بھی میں ،آج کا پیغام بھی میں

گوتمام تخلیق کاروں نے ہر ممکن یہی کوشش کی ہے کہ خواتین کے نت نئے مسائل کو حل کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں مردوں کی برابری کا درجہ دیا جائے اور اس کی تخلیقات کو قدرو منزلت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔یہ مرد وخواتین دونوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج عورت بڑے بڑے شعبوں میں بالخصوص ادب کے میدان میں آگے بڑھ رہی ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو ادب میں مسائل نسواں کو حل کرنے کی بے پناہ جدو جہد نہ صرف عورتوں نے کی ہے بلکہ مرد ادیبوں نے بھی کبھی ناولوں ،کبھی افسانوں اور کبھی اپنی شاعری کے ذریعے نت نئے خیالات پیش کیے ہیں۔علاوہ ازیں انھوں نے ادب میں اقدار وروایات کی چکی میں پستی آزادی کی خواہاں خواتین کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے اس کی انسانی اور صنفی حیثیتوں کو ملحوظ رکھا ہے۔مزید برآں ان مرد وخواتین ادیبوں نے ایسے نسوانی کردار تخلیق کیے جس میں آئیڈیل لڑکی بننے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے اور جو ہر طرح کے مسائل کا سامنا کرتی نظر آتی ہیں۔گو اردو ادب میں عورت اہم اور مرکزی موضوع ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں چاہے عالمی سطح پر ہو یا ملکی سطح پر، پہلے خواتین کی سماج میں کوئی حیثیت نہیں تھی ۔پھر رفتہ رفتہ خواتین کے اندر بھی ایک حد تک آزادی کا جذبہ نمو دار ہونے لگا اور ادب کے میدان میں بھی آنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ اردو ادب میں بھی تحریک حقوق نسواں کا آغاز ہوا۔نتیجتاً زندگی کے تمام شعبوں میں خواتین نے نمایاں ترقی اور کامیابی حاصل کی۔ بالخصوص خواتین نے ادب کے میدان میں وہ کارنامے انجام دیے جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

□□□

Dr. Nighat Amin
D\O Mohd Amin Bhat
Drusoo Jagir,Watergam,
Distt Baramulla-193303 (Jammu &Kashmir)
Ph: No:6006771724

نکہت زہرا

جوش ملیح آبادی

جدید مرثیے کا نقاشِ اول

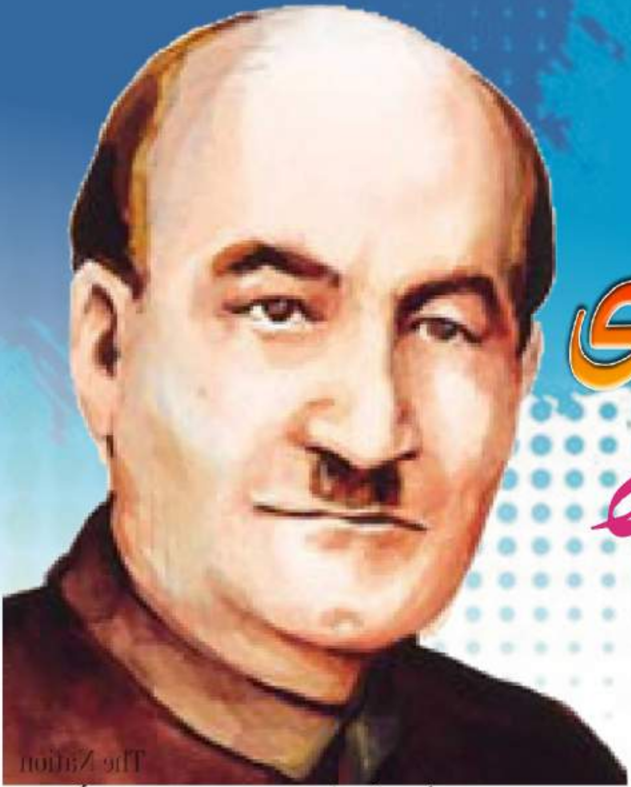

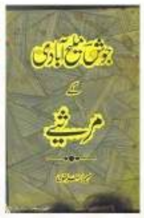

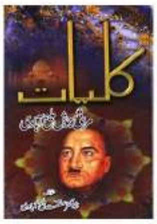

اردو شاعری کی عظیم القدر اصناف میں مرثیہ اجتماعی اہمیت کا حامل ہے۔اس لیے نہیں کہ اس کا تعلق مذہب سے ہے اور اس لیے بھی نہیں کہ لوگوں کا عقیدہ اس صنف کے تئیں پائیدار رہے۔درحقیقت مرثیوں کی برتری کا سبب نہ تو مذہب ہے اور نہ ہی عقائد، بلکہ اس کی عظمت، شان و شوکت، قدرو منزلت انسانی تخمینہ کا نتیجہ ہے جو صنفِ مرثیہ کو مقامِ بلندی تک لے آئی۔آج تک اردو میں کوئی بھی صنف ایسی وجود میں نہیں آئی جس نے مرثیہ کی طرح انسانی جذبات، اخلاقی اقدار اور فنی محاسن سے ایک ساتھ واقف کرایا ہو، ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی اپنی کتاب کے مقدمہ میں مرثیہ کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ

> ''اردو کی تمام اصناف میں شعریات کو نثری تخلیق پر فوقیت حاصل رہی ہے اور شعریات میں سب سے مقبول صنف مرثیہ ہے''۔(ڈاکٹر فاضل احسن ہاشمی، مقدمہ، عرفانی مراثی۔ص 7)

اس لیے آج اردو مرثیے کو ادب میں جو مقام حاصل ہے وہ نفس انفرادی ہے۔دراصل مرثیہ کی ابتدا کائنات کے خلق ہونے کے بعد ہی ہوئی۔جب حضرت آدمؑ نے اپنے بیٹے ہابیلؑ کے غم میں سریانی زبان میں مرثیہ کہا جو عالمی ادب کا پہلا مرثیہ تھا۔اردو ادب کا پہلا مرثیہ اشرف بیابانی کا 'نوسرہار' (1503) کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

اگرچہ تاریخی نقطہ نظر سے مرثیہ ایک قدیم صنفِ ہے، لیکن آج بھی ایک زندہ اور متحرک صنف سخن ہے۔واقعہ کربلا کا ذکر کرنے کے لیے اس کی ضرورت و اہمیت آج بھی قائم و دائم ہے۔اس صنف نے اپنی پیدائش سے لے کر عصرِ حاضر تک متعدد سیاسی، سماجی اور اقتصادی انقلابات کا مشاہدہ کیا اور اپنی فنی و مضوعاتی ساخت میں ردوبدل سے بھی کام لیا ہے۔لیکن انیس اور دبیر کے دورِ عروج سے قبل مرثیہ میں کوئی ایسی نمایاں تبدیلی دیکھنے میں نظر نہیں آئی تھی کہ جس کی بنیاد پر قدیم اور جدید کے درمیان واضح فرق نظر آتا۔1857 کے بعد جدید اور قدیم شاعری کے درمیان حد بندی کے تصورات پیدا ہونا شروع ہوئے جس کے نتیجے میں ناقدین اور شعرا کے یہاں جدید مرثیے کا شعور پیدا ہوا۔اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز میں شاد عظیم آبادی اور مرزا محمد جعفر اوج نے مرثیہ کو جدید آہنگ عطا کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس بنیاد پر ان کو جدید مرثیے کا بانی کہہ دینا ادبی انصاف نہیں ہے۔ان دونوں مرثیہ نگاروں کے بعد جوش ملیح آبادی اور ان کے معاصرین' آل رضا، جمیل مظہری' کا دور شروع ہوتا ہے۔جن کے مرثیوں میں جدید رنگ معمولی فرق کے ساتھ پہلے سے زیادہ واضح نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جدید مرثیے کا بانی قرار دینے میں ناقدینِ فن کو نہایت احتیاط اور چھان بین سے کام لینا پڑا ہے۔اس ضمن میں تحقیق بڑی معاون ثابت ہوتی ہے کہ؛

> ''جوش خود آل رضا کو جدید مرثیہ کا بانی کہتے ہیں حالانکہ اصلاحی پہلو شاد عظیم آبادی کے مرثیوں میں تھا اور ان کا لب و لہجہ انیس و دبیر کے مراثی سے بالکل الگ تھا مگر ناقدینِ فن

جدید مرثیہ نگاروں میں شاد کو شمار نہیں کرتے ہیں اور اس کا سلسلہ جوش سے ہی شروع ہوتا ہے"۔(ایضاً ،ص18)

لہٰذا جوش 1896 تا 1982 کے جدید اردو مرثیہ کے بانی اور معمار اول سمجھے جاتے ہیں۔

اسی طرح جدید مرثیہ کی ابتدا میں سید آل رضا کی بانیت کو تسلیم کرنے والوں کو شاید اس بنا پر مغالطہ ہوا ہے کہ سید آل رضا عمر میں جوش سے بڑے تھے۔جبکہ انھوں نے اپنا پہلا مرثیہ 1939 میں امام باڑہ ناظم آغائی صاحب لکھنؤ میں پڑھا تھا اور ٹھیک دس سال بعد اسی امام باڑے میں جوش نے اپنا دوسرا مرثیہ "حسین اور انقلاب" 1941 میں پڑھا تھا،اور پہلا مرثیہ "آوازِ حق" 1918 میں لکھا تھا۔اسی لیے جوش نے انھیں احتراماً جدید مرثیہ کا بانی قرار دیا ہے،اسی طرح سید آل رضا کو عاشور کاظمی نے جدید مرثیے کا 'مخلص وکیل' کہا ہے نہ کہ نقاش اول۔

جہاں تک سوال ہے جمیل مظہری کی بانیت کے انکار کا تو وہ عمر میں جوش سے تقریباً سات سال چھوٹے تھے۔اس طرح ان کی شاعری کا آغاز جوش کی شاعری کے بعد ہی ہوتا ہے۔دوسری دلیل استاد محترم کے استاد فضل امام کا وہ قول ہے جس میں جمیل کو مرثیے کی جدیدئے کو مہمیز کرنے والا کہا گیا ہے کہ "جمیل مظہری نے اردو مرثیے کی جدیدئے کو مہمیز کیا" ہے۔

(مضمون "اردو میں مرثیہ نگاری کا اجمالی جائزہ" پروفیسر فضل امام۔ ماہنامہ "نیا دور" دسمبر 2010)

لہٰذا جمیل کو جدید مرثیہ کا نقاشِ اول کہنے کے بجائے ترقی پسند حامی کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا،کیو انھوں نے مفید جدید خیالات کو واقعاتِ کربلا سے ہم آہنگ کرنے کی راست کوشش اس وقت کی ہے جب جوش کی ڈالی ہوئی جدید مرثیے کی بنیاد پر سید آل رضا اپنی مخلصانہ وکالت کے ذریعے اپنی عمارت کھڑی کر چکے تھے۔اس طرح جمیل مظہری بھی نقاشِ اول کے دائرے سے خارج ہوجاتے ہیں۔جملہ دلائل وقرائن کی روشنی میں بخوبی ثابت ہوتا ہے کہ جدید مرثیے کی بانیت کا سہرا جوش ملیح آبادی کے سر ہے لہٰذا ان کا جدید مرثیے کا نقاشِ اول ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

جوش نے اردو مرثیے کو نیا شعور عطا کیا،مظلومیت،صبر،گریہ و زاری سے ہٹ کر سرپرستی،باعزت زندگی،جہاد حریت جیسی خوبیوں سے اپنے مرثیوں کو مزین کیا۔بیسویں صدی سے قبل مرثیہ نگاروں کا مقصد صرف امام حسینؓ کے انصار واقربا کا ذکر کر کے سامعین مجلس کو رُلانا تھا،لیکن بیسویں اور اکیسویں صدی کی مرثیہ نگاری مختلف ہے۔عصر حاضر کے مرثیہ گویوں کا مقصد صرف رونا ورلانا نہیں ، بلکہ امام حسین اور ان کے انصار واقربا کی شہادت کا جذبہ اور ان کے حوصلوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ پیغام دینا ہے کہ امام حسین کی طرزِ زندگی کو ہم اپنی عملی زندگی میں لائیں اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن رہیں۔جیسا کہ جوش نے اپنے ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ؛

"مرثیہ گو کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہئے کہ بکا پر تان ٹوٹے، مرثیہ لکھتے وقت کوئی مصرع یا بند رقتِ قلب کا آجائے تو اور بات ہے لیکن اس کی نیت میں نہ ہو کہ رلا کر اٹھائے بلکہ جھنجھوڑ کر اٹھائے جذبہ تاسی حسین پیدا کرنا مرثیہ گو کا فرض ہونا چاہیے" (جوش ملیح آبادی،جدید مرثیے کے تین معمار،ص:12)

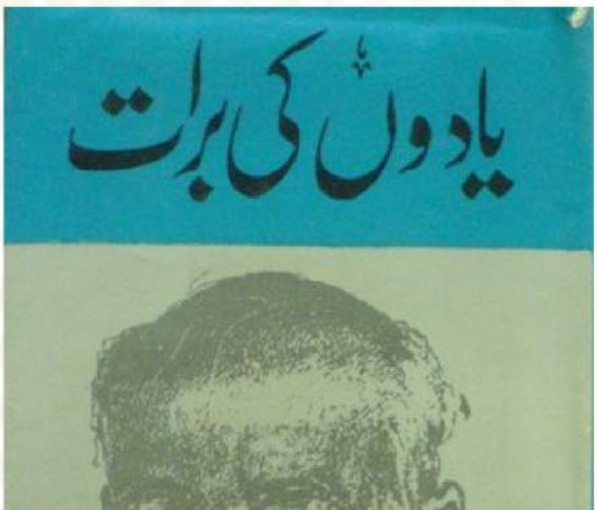

جوش کا پہلا مرثیہ "آوازِ حق" کے نام سے 1918 میں منظر عام پر آیا۔اس کا پہلا مصرعہ 'کیوں نہ کروں شکر خدائے دو جہاں کا' ہے۔یہ مرثیہ اس دور میں لکھا گیا جب ہندوستان کی جنگ آزادی پورے شباب پر تھی۔ جوش نے اپنے اس مرثیہ کے ذریعہ وطن اور اہل وطن کے حق میں جدوجہد اور جنگ آزادی کے لیے قوم کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔جیسا کہ جوش فرماتے ہیں۔

اے قوم وہی پھر ہے تباہی کا زمانہ

جوش نے ''آوازِ حق'' میں شہادت امام حسین کی معنویت ومقصدیت کو اچھوتے انداز اور دلکش پیرائے میں اجاگر کیا ہے، اور امام حسینؑ کے پیغام کو لوگوں تک پہچانے کی کوشش کی ہے، نیز امام حسینؑ کے درس کو عملی زندگی میں برتنے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے اس مرثیہ کے ذریعہ عوام کے دل میں جوش وجذبہ، ہمت وشجاعت، بے باکی، اعلی اقدار، حقانیت اور حق شناسی کا جذبہ پیدا کیا ہے۔

جوش کا دوسرا مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' 1944 میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے امام حسین کو انسانیت کا آئیڈل کہا ہے۔ اس مرثیہ کے ذریعہ پہلی بار عوام نے محسوس کیا کہ واقعاتِ کربلا کے ذریعہ انسانی ذہنوں میں اس طرح بھی انقلاب لایا جا سکتا ہے۔ جوش نے جب پہلی بار اس مرثیے کو امام باڑہ آصفی لکھنو میں سامعین کے روبرو پیش کیا، تو اس وقت مجلس کا منظر کیا تھا خود انھیں کی زبانی ملاحظہ کیجیے کہ

> ''حسین اور انقلاب سننے کے لیے پورا ادبی لکھنؤ ٹوٹ پڑا تھا امام باڑے میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ لکھنو کے تمام شعرا، تمام اساتذہ یہاں تک کہ مولانا صفی بھی تشریف لائے، مجلس میں فقط شیعہ ہی نہیں، اہل سنت اور ہندو بھی شامل ہوئے تھے، چونکہ اس مسدس میں آہ وفغاں پر زور دینے کے بدلے، ایثار اور کردارِ حسین پر عمل کرنے کی پہلی بار ترغیب دی گئی تھی اس لیے ارباب مجلس نے بالعموم اور اعیان سیاست نے بالخصوص بار بار کھڑے ہو کر اس جوش وخروش سے داد دی تھی، اور ایسے معلوم ہو رہا تھا کہ سامعین اپنے گریبان پھاڑ کر میدان جنگ میں کود پڑیں''۔

(جوش ملیح آبادی، یادوں کی بارات۔ ص 267)

جوش نے اپنے اس مرثیہ میں امام حسینؑ کی شجاعت، شان وشوکت، عزم وہمت، صبر وقناعت اور واقعۂ کربلا کی اصل روح کو نہایت اچھوتے انداز میں بیان کیا ہے، ایک بند ملاحظہ ہو؛

جو کاروانِ عزم کا رہبر تھا وہ حسینؑ
خود اپنے خون کا جو شناور تھا وہ حسینؑ
ایک دینِ تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ
جو کربلا کا داورِ محشر تھا وہ حسینؑ
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

یہ مرثیہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی مقبولیت نے عوام وخواص کو جدیدیت کے واضح رجحانات سے روشناس کرایا۔ جوش نے فکری وفنّی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس صنف کو ایک نیا رنگ وآہنگ فراہم کیا۔ ان کے یہاں رفعتِ کردار کا مادہ پایا جاتا ہے جس کے ہیرو امام حسینؓ ہیں، کہ کس طرح جوش نے امام حسین کو مسندِ فضیلت بخشی ہے اور ان کے ذریعہ مسلح انقلابی جذبہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کیا۔ اس لیے اگر جوش کو انقلاب پسند مرثیہ گو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

جوشنے اپنے مرثیوں میں حق وباطل کے پیرائے میں نئی نئی تعبیرات پیش کی ہیں۔ جس کے ذریعہ حب الوطنی، ظلم شکنی اور شعلہ بیداری جیسے خیالات کو پیش کر کے سماج میں پھیلی مایوسی اور مستقبل سے بیزاری کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ کے مصائب وآلام کی پیش کش میں کافی چستی اور جدت بیانی سے کام لیا گیا ہے، اور ان کے یہاں شہادت کا منظر بھی بڑی کثرت سے دیکھنے کو ملتا ہے:

رک رک کے جو تلوار چلی خشک گلے پر
زہرا کی صدا آئی کہ آہستہ ستمگر
حیدر نے بڑے پیار سے زانو پہ لیا سر
گردوں کی طرف دیکھ کے بولے یہ ستمگر
شکوہ نہیں نکلا میرے پیاسے کے لبوں سے
نکلی ہے میری روح نواسے کے لبوں سے

جوش نے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی بصیرت سے کام لے کر مرثیہ نگاری کو ایک نیا رخ دیا ہے۔ بقول اسدار یب ''جوش کا مرثیہ ''حسین اور انقلاب'' اور ان کا مسدس ''طلوع فکر'' مسدس کی روایت میں زور بیاں، حسن معنی اور شکوہ مضامین کے اعتبار سے ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے''۔ (اسدار یب، اردو ادب کی مرثیے کی سرگزشت۔ ص 87)

جوش نے عظمتِ امام حسینؓ کے ساتھ ساتھ عظیم الشان کربلائے معلیٰ کو بھی علوِشان عطا کیا ہے، کربلا اپنے آپ میں بقائے دوام ہے، اور اس کے ذریعہ جوش نے اپنے مراثی کو آراستہ وپیراستہ کیا ہے۔ بند ملاحظہ ہو؛

کربلا اب بھی حکومت کو نگل سکتی ہے
کربلا تخت کو تلوؤں سے مسل سکتی ہے
کربلا خار تو کیا آگ پہ چل سکتی ہے
کربلا وقت کے دھارے کو بدل سکتی ہے
کربلا قلعہ فولاد ہے جراروں کا
کربلا نام ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

اسی طرح جوش نے اس مرثیہ میں جبلیت آدم کی گرہ کشائی بھی کی

ہے اوراس کی ذات کا تہذیبی وتمدنی جائزہ بھی لیا ہے۔ جب تہذیب وتمدن اپنے ملک میں زوال پذیر ہونے لگی تو واقعۂ کربلا اور اس کے ہیرو کی ضرورت در پیش آئی ،جس کو مدنظر رکھتے ہوئے جوش نے نسلِ انسانی کی تاریخ اور کربلا کی اہمیت کے درمیان ربط پیدا کرنے کی اچھی کوشش کی ہے۔

ان کا تیسرا مرثیہ ''موجد ومفکر'' کے نام سے1956 میں شائع ہوا۔ جس میں انسانی تہذیب، اخلاقی شعور اور فکر کی اعلیٰ قدروں کو پیش کیا گیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ انسان کے اندر آدمیت، مروت واخوت کی صفات ہونی چاہیے، تاکہ انسانی جذبات کی گہرائی کے ساتھ ساتھ ان کی عملی ونظری وسعتوں سے آگاہی حاصل ہوسکے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

آدمی میں رفتہ رفتہ آدمیت آ گئی
وضع میں تمکیں جذبوں میں نزاکت آ گئی
بات میں تاثیر آنکھوں میں مروت آ گئی
روح فرسا اجنبیت میں اخوت آ گئی
شور ہائے غم گساری کو بھڑکنا آ گیا
دل کو اوروں کی مصیبت میں دھڑکنا آ گیا

دیکھ پھر قعرِ جہنم بن چکا ہے روزگار
آنچ میں غلطیدہ ہے پھر خیمۂ لیل ونہار
سر زمیں پر حکمراں ہے باہزاراں اقتدار
آتش دود و دخان و شعلہ و ورق وشرار
زندگی ہے بر سر آتش فشانی یا حسین
آگ دنیا میں لگی ہے ، آگ پانی حسین

مرثیہ کا یہ بند شاہکار فکر کا حامل ہے اور اس بیت میں آج کے سماجی اور سیاسی پس منظر میں گہری معنویت پوشیدہ ہے۔ ان کا چوتھا مرثیہ ''وحدت انسانی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مرثیہ میں تہذیبی ،جذباتی، قومی یکجہتی اور حسن اخلاق جیسے پنہاں ہیں۔ جوش فرماتے ہیں؛

اے دوست سعی امن سے ہو شاد و با مراد
انسان کے دماغ کا سرطان ہے عناد
اپنے غضب سے، جنگ سے، سب سے بڑا اجہاد
لاکھوں میں بے نظیر کروڑوں میں فرد ہے
جو مسکرائے طیش میں بیشک وہ مرد ہے

اس بند میں جوش ہمیں یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ انسان اپنی کوششوں سے ہی خوش وخرم رہ سکتا ہے، البتہ انسان کا ذہنی افق تکبر کی طرف مائل ہو جائے تو وہ خود کا سب سے بڑا دشمن بن جاتا ہے، اور انسان اپنے آپ سے جنگ کرے تو وہ مجاہد بن جاتا ہے، اور جو انسان طیش میں مسکرائے اصل میں وہی مرد مجاہد کہلاتا ہے۔

جوش کا پانچواں مرثیہ ''طلوع فکر'' 1857 میں منظر عام پر آیا۔ جس میں حضرت علی کی یومِ ولادت سے متعلق تفصیلات پیش کی گئی ہیں، یہ منقبت اور قصیدہ کی ہیئت پر مبنی ہے۔ اس میں انھوں نے مناظر فطرت کی رنگینی کو بہترین پیرائے میں نکھارا ہے۔ مناظر فطرت ان کی خداداد صلاحیتوں میں سے ہے گویا فطرت پسندی انہوں نے ورثے میں پائی ہے، جس کے سبب ان کو شاعر فطرت کہا جاتا ہے۔ بقول ضمیر اختر نقوی 'جوش الفاظ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ گونجتے، گرجتے ہوئے وجد کرتے ہیں' (ضمیر اختر نقوی، اردو مرثیہ پاکستان میں۔ ص122)

ایک بند ملاحظہ ہو؛

جب چہرئے افق سے اٹھی سرمئی نقاب
کانپے نجوم، زرد ہوا روئے ماہ تاب
کھلنے فلک کے جام ، کھلے سرخیوں کے باب
اڑنے لگا عبیر، برسنے لگی شراب
رنگوں کی آب و تاب چرانے لگی فضا
آہستگی سے ہوش میں آنے لگی فضا

ان کا چھٹا مرثیہ ''عظمت انسانی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مرثیہ کا آغاز بھی قصیدہ سے ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی ان کے مرثیے میں نالہ وشیون کی طرف کم رجحان نہیں ہے۔ بلکہ ان کے یہاں بین کے تاثرات تھوڑے مختلف ہیں۔ کربلا کے میدان میں دوپہر کے وقت آگ برساتے ہوئے سورج کے نیچے امام حسینؑ کے تن وتنہا کھڑے ہونے کی کیفیت کو جوش کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں، ایک بند ملاحظہ ہو:

چشم نمناک میں پر تو روئے بے شیر
سانس لیتے تھے تو چبھتا تھا جگر میں اک تیر
برق جوالہ کی تھی موج ہوا میں تاثیر
اور اس نقطۂ حدت پر کھڑے تھے شبیرؑ
کہ جہاں دھوپ کچھ اس طور سے برساتی تھی
سینۂ برف سے بھی آنچ نکل آتی تھی

جوش نے اس مرثیہ میں آدمی کی آدمیت اور اس کی صفات کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آدمی کو دونوں جہاں کی دولت نوازی گئی ہے، آدمی اس دنیا کا وارث ہے، اس کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے؛

آدمی دولت دارین متاعِ دوراں
آدمی نغمۂ داؤد جمالِ کنعاں
آدمی وارث کونین و رئیس دو جہاں
آدمی بربطِ محرابِ جہانِ گذراں
دور میں نازشِ آفاق کا جام آتا ہے
لبِ گیتی پہ جب انساں کا نام آتا ہے

جوش کا ساتواں مرثیہ ''زندگی اور موت محمد وآلِ محمد کی نظر میں'' (1965) کے نام سے بڑا مقبول ہوا۔ جوش نے اپنے اس مرثیہ میں فطرتِ انسانی کے منفی عناصر (انانیت پسندی، نخوت، افسردگی وغیرہ) کو نئی فکر اور نئی روح سے روبروکرایا، جس میں تخیل کی کارفرمائی کا گہرا عکس نظر آتا ہے؛

یہ انا ہے وہ قدم جو ڈگمگا سکتا نہیں
جس میں استثنا کے ہاتھوں جھول آ سکتا نہیں
یہ کسی طوفان کو خطرہ میں لا سکتا نہیں
یہ چراغِ داوری ہے جھلملا سکتا نہیں
یہ دلوں کی آبرو، یہ دلوں کی جان ہے
رحلِ نفسِ آدمی پر، یہ انا قرآن ہے

شادماں ہوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے
نقدِ جاں کھوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے
کاٹتا بوتا ہے تواپنی خوشی کے واسطے
جاگتا سوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے
کام رکھتا ہے فقط اپنے ہی مرغوبات سے
کس قدر، انسان کو ہے عشق اپنی ذات سے

ان اشعار میں انانیت پسندی کے ساتھ موت کے تئیں جو رویہ اختیار کیا گیا ہے وہ مثبت کے بجائے منفی فکر کا حامل ہے۔ جوش کا تخیل موت جیسی شئے کو شہد سے بھی زیادہ شیریں قرار دیتا ہے؛

اے محمد اے سوار توسنِ وقت رواں
اے محمد اے طبیبِ فطرت نباضِ جاں
اے محمد اے فقیہِ نفس و نقادِ جہاں
موت کو تو نے وہ بخشی آب تاب جاوداں
زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے
لوگ پیغامِ اجل کی آرزو کرنے لگے

اس مرثیہ میں جوش نے دردِ زندگانی کی بات کی ہے، کہ کس طرح درد جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو انسان اس کرب اور بے چینی میں اپنے درد کا علاج زہر میں بھی تلاش کرتا ہے۔ اس کو دردِ مصیبت سے جب نجات نہیں ملتی تب وہ خودکشی کا راستہ اختیار کرتا ہے، اس دنیا میں آدمی عشرت ومسرت کے لیے جیتا اور مرتا ہے۔ جوش کا آٹھواں مرثیہ ''پانی'' کے عنوان پر ہے۔ یہ صرف پانی کی مدح میں کہا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ جوش نے پانی کی تعریف وتوصیف میں مختلف ماہیت، مزاج اور قسمیں رقم کی ہیں، ایک بند ملاحظہ ہو؛

پانی خوش اضطراب وخوش انداز وخوش جمال
خوش آب وخوش خرام وخوش آواز خوش مقال
شیریں قوام و شیشہ مزاج و گہر خصال
سرشاری و شگفتگی و رقص و وجد و حال
سرمایہ آب و رنگ کی تانیں لیے ہوئے
لاکھوں ہر ایک بوند میں جانیں لیے ہوئے

جوش کا نواں مرثیہ ''آگ'' کے نام سے 1959 میں شائع ہوا، یہ جوش کا سب سے مختصر 9 بندوں پر مشتمل مرثیہ ہے۔ انھوں نے آگ، پانی ،موت، وحدت، انسان اور انسانی نفسیات کی گتھیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مرثیہ کے موضوع کو ایسی بلندی اور وسعت عطا کی ہے، کہ اس کے بعد کسی جدید مرثیہ گو کے یہاں یہ لوازمات نہیں ملتے۔ جوش کے نقشِ پا سے مرثیے نے اپنی کھوئی ہوئی مقبولیت دوبارہ حاصل کرلی، جو قوتِ اظہار، بیباکی، اور آزادانہ فطرت ان کے یہاں موجود ہے وہ دیگر مرثیہ گویوں کو نصیب نہیں۔ جوش نے سیاسی معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی بصیرت سے کام لے کر مرثیہ نگاری کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔ جیسا کہ زین الحیدری کاکوروی تحریر فرماتے ہیں کہ:

''جوش کا کلام اردو زبان کی پیشانی کا ایسا دیدہ زیب جھومر ہے جسے دیکھ کر اپنے اور بیگانے سب مسحور ہوجاتے ہیں، ان کا کلام اردو ادب کی وہ درخشاں افشاں ہے جس نے عروسِ اردو کی مانگ میں چار چاند لگا دیے''۔

(زین الحیدری کاکوروی، جوش کی مرثیہ نگاری کا عرفانی پہلو۔ ص 9

Ms. Nikhat Zahra
D/o Qasim Ali
156, Near Sabzimandi,
Abdullahpur, Akbarpur
Ambedkar Nagar-224122 (U.P)

سارہ بتول

’آئینہ کشمیر‘ یا ’خطّۂ بے نظیر کشمیر‘

(ریاست جموں و کشمیر میں لکھا گیا قدیم ترین منظوم سفرنامہ)

انسانی زندگی حرکتِ مسلسل اور سفر کا دوسرا نام ہے۔ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی اس کی زندگی کے سفر کی شروعات ہوتی ہے جو آخری سانس تک جاری رہتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو چنداں مضائقہ نہ ہوگا کہ سفر انسانی فطرت اور جبلت کا حصہ ہے۔ انسان اپنی بقا اور مرادوں کی حصولیابی کے سلسلے میں مختلف جگہوں کا سفر کرتا ہے اور مختلف مراحل طے کرتا ہے۔ دورانِ سفر وہ کبھی مختلف خطرات اور مشکلات سے دوچار ہوتا ہے تو کبھی مختلف قدرتی نظاروں کی دلفریبیوں سے محظوظ ہوتا ہے۔ ہر ایک حالات و واقعات کا مشاہدہ کرتا ہوا انسان اپنے سفر کی تمام رعنائیوں کو دوسروں کو سنانا چاہتا ہے اور یہی فطرت انسانی سفرنامے کا موجب بنی۔ ہیروڈوٹس Herodotus کو اولین سفرنامہ نگار مانا جاتا ہے۔ میگا ئیتھیز، فاہیان، ہیون سانگ، البیرونی اور ابن بطوطہ کے سفرناموں سے اسی انسانی جبلت کا پتہ چلتا ہے۔ دنیا کی ہر زبان میں میں سفرنامے کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ اردو میں سفرنامے کی شروعات 1847ء میں یوسف خان کمبل پوش کے ”عجائباتِ فرنگ“ سے ہوتی ہے اور پھر دیگر اصناف ادب کی طرح اس کی شاخیں پھیلتی گئیں اور جڑیں مضبوط ہوتی گئیں۔ مسافرانِ لندن، سفرنامہ افغانستان، سیر پنجاب، سفرنامہ مصر و روم و شام وغیرہ ابتدائی دور کے تحریر کردہ اردو کے اہم سفرنامے ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو نثر نگاری کی ابتدا 1860 کی دہائی میں مہتہ شیر سنگھ کے ”سفرنامہ بخارا“ سے ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ اس وفد کی کارگزاریوں اور روداد پر مشتمل سرکاری روزنامچہ نما رپورٹ ہے جس نے مہتہ شیر سنگھ کی قیادت میں وسطی ایشیائی ممالک کا دورہ کیا تھا۔ چونکہ اس دور میں فارسی آمیز اردو کا چلن عام تھا اس لیے یہ سفرنامہ بھی فارسی آمیز اردو نثر کی صورت میں ہے مگر محققین کا اس امر میں اتفاق رائے ہے کہ ”سفرنامہ بخارا“ ریاست میں اردو نثر کی اولین تحریر ہے۔ ریاست میں ادبی سفرنامے کے ابتدائی نقوش سالک رام سالک کے ”تحفۃ السالک“ میں ملتے ہیں اور محمد الدین فوق کے ”سفرنامہ کشمیر“ سے یہاں پر باضابطہ سفرنامے کے فن کی شروعات ہوتی ہے۔ اسی ابتدائی دور کے ریاست میں لکھے گئے سفرناموں میں خان بہادر پیرزادہ محمد حسین عارف کا منظوم سفرنامہ ”آئینۂ کشمیر“ یا ”خطۂ بے نظیر کشمیر“ ہے۔

’آئینۂ کشمیر‘ یا ’خطۂ بے نظیر کشمیر‘ ریاست جموں و کشمیر میں لکھا گیا ایک قدیم ترین منظوم سفرنامہ ہے۔ جو خان بہادر پیرزادہ محمد حسین عارف کے کشمیر کے دورے کی سفری روداد ہے۔ پیرزادہ محمد حسین نے لاہور سے تعلیم پائی تھی اور عدالت کے جج بن گئے۔ حکومت کی طرف سے انھیں خان بہادر اور سی۔آئی۔ای کے اعزازات اور خلعت بھی ملی تھیں۔

ان کی منصفانہ اور عادلانہ صلاحیت کے پیش نظر مہاراجہ کشمیر نے ان کی خدمات مستعار لی۔ 1906 میں وہ بحیثیت چیف جسٹس کشمیر وارد ہوئے۔ کشمیر میں قیام کے دوران انھوں نے 'راولپنڈی سے کشمیر تک کے اپنے سفری روداد کو' آئینہ کشمیر'' کے نام سے اپنی معرکتہ الآرا نظم میں پیش کیا جو اس وقت کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ یہ نظم 165 اشعار پر مشتمل تھی۔ منظور الحق صدیقی (ایم۔اے) کے مطابق اس کا مکمل نسخہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں ہے۔ مگر بعض مصلحت کی بنا پر پیرزادہ نے اس نظم کو کچھ حصوں کے تحذیف کے ساتھ رسالہ '' مخزن'' کے اکتوبر

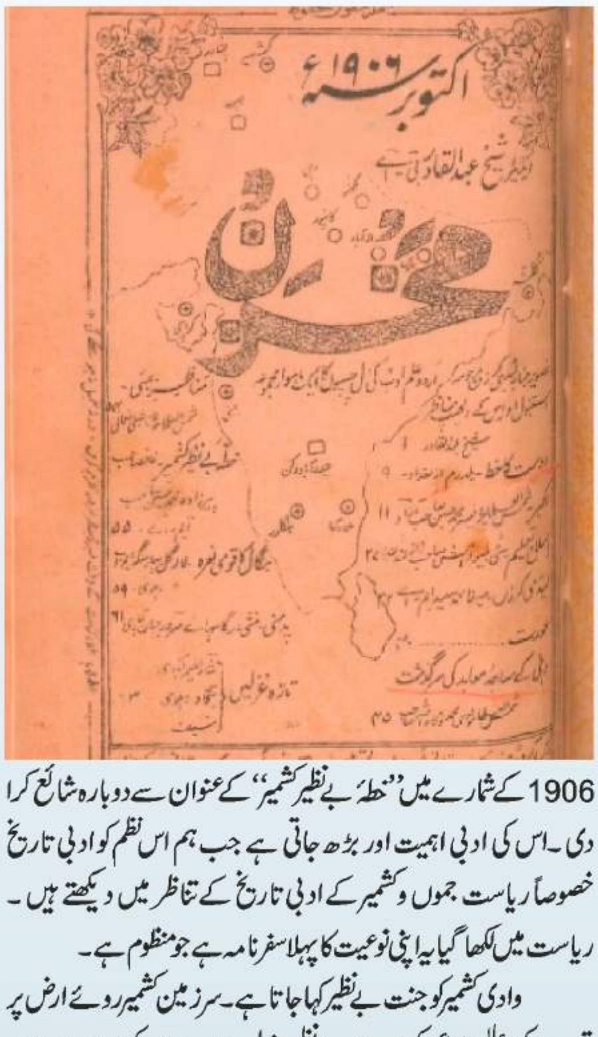

1906 کے شمارے میں ''خطۂ بے نظیر کشمیر'' کے عنوان سے دوبارہ شائع کرا دی۔ اس کی ادبی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے جب ہم اس نظم کو ادبی تاریخ خصوصاً ریاست جموں و کشمیر کے ادبی تاریخ کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ریاست میں لکھا گیا یہ اپنی نوعیت کا پہلا سفرنامہ ہے جو منظوم ہے۔

وادی کشمیر کو جنت بے نظیر کہا جاتا ہے۔ سرزمین کشمیر روئے ارض پر قدرت کی اعلیٰ صناعی کی عمدہ اور بے نظیر مثال ہے۔ یہاں کی سرسبز وادیاں، برف پوش چوٹیاں، اونچے اونچے سدابہار درختوں سے ہرے بھرے ٹیلے، سنگلاخ چٹانوں کے سینوں کو چیرتے ہوئے آبشار، جوئے شیر کی طرح بہتی ندیاں، خاموش اور پرسکون جھیلیں اور سبز مخملی سبزہ زار میدان واقعتاً جنت کا حصہ ہی لگتے ہیں۔ ایسی قدرتی خوبصورتی کی مثال شاید ہی روئے زمین پر اور کہیں ہو۔ یہی وجہ ہے مغل شہنشاہ جہانگیر جب پہلی بار کشمیر کو دیکھتا ہے تو اس کی خوبصورتی پر عش عش کرتا ہے اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

اگر فردوس بروئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

پیرزادہ محمد حسین عارف کا حال بھی جہانگیر اور شیرازی سے مختلف نہیں تھا۔ وادئ کشمیر کی خوبصورتی اور قدرتی مناظر سے وہ ایسے متاثر ہوتے ہیں کہ ان کی زبان سے بھی بے ساختہ اشعار جاری ہونے لگتے ہیں اور یوں یہ شاہکار منظوم سفرنامہ معرض وجود میں آتا ہے۔ انھوں نے مختلف تمثیلات، تشبیہات اور محاورات کے ساتھ ان تمام مناظر کو منظوم بیان کیا ہے چونکہ پیرزادہ عارف کو زبان و بیان پر قدرت اور شاعری پر ملکہ حاصل تھا اور صنائع و بدائع اور استعارات کا برملا اظہار جانتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم کا ہر ایک بند ایک ایک منظر کی عکاسی کرتا ہے جس کی وجہ سے نظم میں ایک اچھوتا پن اور ایک نرالا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔ الفاظ کے انتخاب پر انھیں قدرت کاملہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سادہ اور آسان زبان میں سادگی کے ساتھ ہر ایک منظر کو ایسے بیان کیا ہے کہ ہر ایک بند دل میں اتر تا جاتا ہے۔ جس جس جگہ سے وہ گزرتے ہیں ہر ایک منظر کی تصویر کشی اور منظر کشی اس انداز میں کرتے ہیں کہ نظم کو پڑھنے والا خود کو ہر ایک منظر میں موجود پاتا ہے۔ پرانے زمانے سے ہی وادی کشمیر کی سڑکوں پر خصوصاً شاہراہ بارہ مولہ سے اننت ناگ تک دورویہ سفیدے کے درخت ایستادہ ہیں جس سے شاہراہ پرشکوہ اور دلفریب لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے باوردی سپاہی دورویہ مارچ کرر ہے ہوں۔ اس خوبصورت منظر کی گرفت سے کوئی نہیں نکل سکتا۔ مسافر اس نظارے کی خوبصورتی اور طلسم میں کھو جاتا ہے۔ یہ نظارہ عارف کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ جس سے متاثر ہو کر وہ پکار اٹھتا ہے:

ہوا کشمیر میں داخل تو بارہ مولہ میں میں نے
سفیداروں کی پلٹن کو سر رہ پر جما دیکھا
ہرے کوٹ اور پتلونیں سفیدان کی یہ وردی تھی
برابر تھے کوئی اُن میں نہ چھوٹا اور بڑا دیکھا
اثر منظر کا کیا دل پر ہوا کچھ کہہ نہیں سکتا
سماں میری نہ آنکھوں نے کبھی پہلے یہ تھا دیکھا

اس سفرنامہ میں پیرزادہ عارف نے کشمیر کی خوبصورتی، عوام کی سماجی وثقافتی زندگی کے ساتھ ان کی معاشی زبوں حالی کو بھی شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم کا آغاز وادی کشمیر کے قدرتی مناظر کی تصویر کشی اور توصیف سے ہوتا ہے۔ پیرزادہ عارف وادی کی خوبصورتی اور اس کے

نظاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ سچ کہتے ہیں جس نے کاشمیر پر فضا دیکھا
تو گویا اس نے جہاں میں گلشنِ جنت نما دیکھا

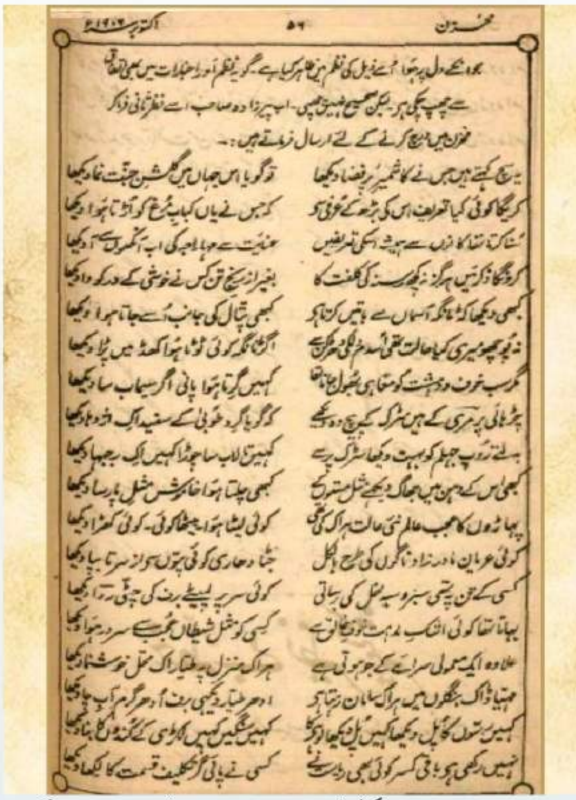
مخزن ۵۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء

پھر عارف اپنی سیر کشمیر کی دیرینہ تمنا کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں جسے مہاراجہ کی مہربانی سے کشمیر کے دورے کی صورت میں میسر ہو پایا:

سنا کرتا تھا کانوں سے ہمیشہ اس کی تعریفیں
عنایت سے مہاراجہ کی اب آنکھوں سے آ دیکھا

پیرزادہ اب سفر کا حال بیان کرتے ہیں جو انھوں نے عموماً ٹانگے پر کی۔ ریاست جموں وکشمیر گرچہ ابتدا سے ہی مرجع خلائق رہی ہے مگر اس کے باوجود ڈوگرہ حکمرانوں کا یہ ایک عجیب اور ناروا رویہ رہا کہ انہوں نے راستوں اور شاہراہوں کی محافظت اور دیکھ ریکھ کا کچھ خاص انتظام نہیں کر رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے راستے ناہموار، شکستہ، مخدوش اور پر خطر تھے۔ جابجا ٹانگے اور سواریاں حادثات سے دوچار۔ عارف اس حالت سے کافی دل برداشتہ دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے راستے کی خستہ حالت، مخدوش صورتحال اور ہولناکیوں کو حسین شعری پیرائے میں پیش کیا ہے:

کروں گا ذکر میں ہرگز نہ کچھ رستہ کی کلفت کا
بغیر از رنج تن کس نے خوشی کے در کو وا دیکھا

کبھی دیکھا کہ کہ ٹانگہ آسماں سے باتیں کرتا ہے
کبھی پاتال کی جانب اسے جاتا ہوا دیکھا
نہ پوچھو میری کیا حالت تھی اُس دم دل کی دھڑکن سیا گرتا
نگہ کوئی ٹوٹا ہوا کھڈ میں پڑا دیکھا

پہاڑوں کے سلسلوں کے اتار چڑھاؤ، وضع قطع اور بسط ونشیط کا تذکرہ اور مناظر قدرت کی عکاسی اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ گویا وہ تمام مناظر اور سلسلے آنکھوں کے سامنے آویزاں ہو جاتے ہیں۔ دریائے جہلم کے کنارے چلتے ہوئے دریاؤں، پہاڑوں اور وادیوں میں اس کی روانی اور میدانوں میں اس کی خراماں خراماں چال کی منظر کشی مختلف تشبیہات اور استعارات کی مدد سے جس فنی مہارت سے کی ہے وہ شاعر کی قدرت کلام پر دال ہے۔ نمونہ کے لیے یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پہاڑوں کا عجب عالم نئی حالت ہر اک کی تھی
کوئی لیٹا ہوا ،بیٹھا کوئی ، کوئی کھڑا دیکھا
کوئی عریاں مادرزاد ناگوں کی طرح بالکل
جٹادھاری کوئی پتوں سے از سر تا پا دیکھا
کسی کے تن پہ تھی سبزہ و سیہ مخمل کی برساتی
کوئی سر پر لپیٹے برف کی چٹی ردا دیکھا
بہاتا تھا کوئی اشکِ ندامت خوف خالق سے
کسی کو مثل شیطان عجب سے سرور ہوا دیکھا

پیرزادہ عارف مناظر قدرت کے مشاہدے کے ساتھ ساتھ باریکی سے عوام کے بود و باش اور رہن وسہن کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس سے ان کی باریک بینی اور سماج شناسی کا پتہ چلتا ہے۔ وہ راستے کی آسائش، ڈاک بنگلوں اور ان میں دستیاب اشیا خورد ونوش کا ذکر کرتے ہوئے ''آب چاء'' کا مخصوص تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ وہی نون چائے ہے جسے ریاست بھر کے عوام شوق سے نوش کرتے ہیں۔ اسی شعری پیرائے میں کشمیری عوام کی کسمپرسی اور غربت وافلاس کا وہ اشاروں کنایوں میں اظہار کرتے ہیں:

میسر ہو نہ کھانے کو تو کچھ پرواہ نہیں ان کو
مگر وہ باش وشہری کو فدائے آب چاء دیکھا

پیرزادہ عارف کشمیر کے اہم تاریخی مقامات مساجد، خانقاہوں، درگاہوں وزیارتوں، مندروں، قلعوں اور محلات غرض ہر جگہ کی سیر کرتے ہیں۔ جھیل ڈل کے ہاؤس بوٹوں سے وہ محظوظ ہوتے ہیں۔ خانقاہ معلیٰ اور درگاہ حضرت بل کی زیارتوں سے وہ روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ ہری

پربت پر شنکر اچاریہ کے مندر کو دیکھ کر عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اہل کشمیر کی مذہبی ہم آہنگی اور یگانگت سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ عمارتوں کی طرز تعمیر اور ان کا مشاہدہ کرتے ہوئے جامع مسجد کا تذکرہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ مسجد کی شاندار طرز تعمیر کا اس سے عمدہ الفاظ میں بیان مشکل ہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ مسجد کے در و دیوار کی شکستہ حالی سے نالاں دکھائی دیتے ہیں۔ خانقاہ معلیٰ کی ایرانی طرز تعمیر اور خطاطی اور نقاشی کے نایاب اور منفرد نمونے ان کو کافی متاثر کرتے ہیں:

ہوس بوٹوں سے دریا کے کناروں کو سجا دیکھا
کلس رگناتھ جی اور شاہ ہمداں کے نہیں تھے یہ

بہت سی مسجدیں دیکھی تھیں ہر طرز عمارت کی یہاں کی
مسجدِ جامع کا نقشہ ہی جدا دیکھا
کلس اس کا طلائی خوبصورت اور بلند ایسا
اٹھا کر آنکھ جب دیکھا تو پگڑی کو گرا دیکھا
ستون لکڑی کے اس کے بیس گز تک ہیں بلند ہی میں
سیہ پتھر کا حوض اس میں نہایت خوشنما دیکھا
نہیں سایہ کسی مسجد میں ہوگا اتنا دنیا میں
مگر اس پہ بھی صحن اس کا نہایت ہی کھلا دیکھا
عجب لکڑی پہ نقاشی ہے اندر شاہ ہمدان کے
نمایاں جابجا حرفوں میں وہاں نامِ خدا دیکھا

پھر اندرون شہر کی خوبصورتی، ہری پربت اور پری محل کا تذکرہ کرتے ہوئے جہلم کے گھاٹوں پر جمع دوشیزاؤں کی خوبصورتی، اندرون شہر کے پلوں (کدل)، اور دریاؤں میں رواں ہاؤس بوٹوں کے ساتھ ساتھ درگاہوں اور زیارتوں اور تیرتھ استھانوں کا تذکرہ کیا ہے:

ہری پربت کی چوٹی پر نمایاں قلعہ اکبر کا
ذرا نیچے محل داراشکوہ کے پیر کا دیکھا
میان شہر میں بہتا بہت کو اور گھاٹوں پر
پریویانِ با عصمت کا ہر جا جم گھٹا دیکھا
نئی وضع کے پل دیکھے کدل کہتے تھے یاں جن کو

اندروں شہر مساجد، خانقاہوں، تیرتھ استھانوں اور دیگر تاریخی عمارات کی سیر کے بعد پیرزادہ عارف مغل باغوں کی سیر کو جاتے ہیں۔ جھیل ڈل کے کنارے کوہِ زبرون کے آغوش میں شالیمار اور نشاط باغ کی خوبصورتی اور طرز تعمیر کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور اس کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

گیا جب سیر کو اک دن میں شالامار کی جانب
تماشا قدرتِ حق کا وہاں میں نے نیا دیکھا
ستون دیکھے سیہ پتھر کے ہیرے سے چمکتی ہیں
اُچھلتا حوض میں چاندنی کا پانی جابجا دیکھا
جہانگیر اور اسکی جانِ جاں نور جہاں کو بھی
تخیل کی نگاہ سے اب بھی وہاں پھرتا ہوا دیکھا

نشاط سے پیرزادہ عارف برفیلے پہاڑوں کے زیر دامن جھیل ڈل کا نظارہ کرتے ہوئے جھیل میں رقصاں و رواں ہاؤس بوٹوں، تیرتے کھیتوں (Floating Garden) کا نظارہ کرتے ہوئے (جس کو اپنی زندگی کا پہلا مشاہدہ سمجھتے ہیں) نسیم باغ اور درگاہ حضرت بل کا نظارہ کرتے ہیں۔ وسیع و عریض علاقے میں پھیلا ہوا چناروں سے ڈھکا ہوا نسیم باغ، سامنے جھیل ڈل کے کنارے چناروں کے آغوش میں مرمریں درگاہ حضرت بل کا روح پرور منظر، ان نظاروں سے وہ کافی متاثر ہوتے ہیں اور جس کی تعریف میں وہ رطب اللسان دکھائی دیتے ہیں:

پڑھا تھا یہ کہ گھر اور کھیت ہیں سب غیر منقولہ
مگر گھر اور کھیتوں کو یہاں چلتا ہوا دیکھا
مسافر بھول جاتا ہے سبھی انکار دنیا کو کنول کے
کھیت کو جب اس نے اس ڈل میں کھلا دیکھا

وادی کشمیر کی اپنی ایک منفرد تہذیب و تمدن، زبان و ادب اور ثقافت ہے اس کا ثانی کہیں نہیں ملتا۔ کشمیر میں دونوں مذاہب کے ماننے والے لوگ یعنی مسلمان اور پنڈت دونوں اپنی مشترکہ تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اپنے اس عظیم ورثے کی حفاظت اور اس کی آبیاری کو اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ دونوں عقائد کے لوگوں کا رہن سہن، زبان و ادب، ملبوسات، بود و باش یکساں ہیں۔ دونوں موسیقی کے عاشق اور رسیا ہیں۔ مذہبی یکجہتی اور خلوص و احترام کشمیر کے ہر فرد میں شاعر کو نظر آتا ہے۔ وادی کے لوگوں کی خوش اخلاقی، خدا ترسی اور مذہبی یکجہتی کا مشاہدہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہر اک جا پہ ہے ایک تیرتھ، ہر ایک جانب زیارت ہے
بہت خوش اعتقاد انکو بہت ہی باخدا دیکھا

ان قدرتی حسن کے نظاروں کے بعد پیرزادہ بڈشاہ (زین العابدین) غنی، فانی، قدسی اور کلیم کے مزاروں پر حاضری دیتے ہیں:

کلیم و فانی و قدسی غنی کی بھی زیارت کی
شکستہ حال زین العابدین کا مقبرہ دیکھا

چونکہ پیرزادہ عارف ایک باعلم منصف ہیں اور ایک عوامی شاعر

ہیں اور انسانیت کا درد رکھتے ہیں اور عوام کی حالت زار سے وہ صرف نظر نہیں کر سکتے۔اس نظم میں بین السطور اخلاقی اقدار بھی سامنے آتے ہیں۔ انھوں نے ان سب قدرتی مناظر اور دلفریب نظاروں کے بیان کے بیچ مجبور و لاچار عوام کی بے کسی و زبوں حالی کا بھی زیر لب تذکرہ کیا ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کی حالتِ کسمپرسی اور غربت اور ناخواندگی پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ایک سرکاری ملازم کا اس طرح کسی مطلق العنان حکومت کے تئیں اتنا کہنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔مگر عارف کا دلیر اور جذباتی دل اس میں جھجکا نہیں اور ساتھ ہی اس کا حل بھی پیش کیا ہے کہ اگر تعلیم سے روشناس کیا جائے تو اس کا علاج ممکن ہے۔مختلف حکمرانوں کے ظلم و بربریت اور استحصال، حکمران طبقے کے ناروا اور انسانیت سوز سلوک سے کشمیری عوام خصوصاً مسلمانوں کی حالت خستہ اور ناگفتہ تھی۔جس کی وجہ سے ان کی حالت قفس میں مقید پرندے کی سی تھی۔ان گنت محصولات و مالیہ اور بیگاری کے بوجھ سے عوام پر فاقوں کی نوبت تھی۔غربت و افلاس سے ان کی صورتحال مایوس کن تھی۔اس دور کو کشمیر کا سیاہ ترین دور کہا جاتا ہے۔پیرزادہ عارف نے اپنے مشاہدے کی گہرائی، شاعرانہ کمال اور استعارات و تلمیح کے استعمال سے اس پوری تاریخی حقائق اور المیہ کو سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے انداز میں چند اشعار میں سموئے ہیں۔جس سے ان کی شعری بالیدگی اور پختگی کا پتہ چلتا ہے:۔

ہے حسن رنگ میں مشہور عالم یہاں کے باشند
لباس ان کا مگر میں نے بہت ہی بد نما دیکھا
اگرچہ ہر جگہ افلاس کا غلبہ ہے خطہ میں
مسلمانوں کا لیکن حال یاں بالکل ہی برا دیکھا
نہ ان میں علم او ودولت نہ عزت اور حکومت ہے
تجارت کے اصولوں سے انہیں نا آشنا دیکھا
علاج اس ذلت و افلاس کا پوچھو اگر مجھ سے
تو چلنا نسخہ اس کے واسطے تعلیم کا دیکھا

وادی کشمیر کی سیر گلمرگ کے بغیر ادھوری سمجھی جاتی ہے۔عارف باہتمام خاص گلمرگ کے سفر کا حال سناتے ہوئے مغربی سیاحوں کا گلمرگ کی تعریف وتوصیف کا ذکر کرتے ہیں:۔

نہیں دنیا میں کوئی صحت گہ کوئی گلمرگ سے بہتر
ہر ایک چپہ زمیں کا لالہ وگل سے بھرا دیکھا
یہ رنگا رنگ پھولوں کی نظر آئی وہاں کثرت
ہر اک میدان ہر اک ٹیلہ پہ ایک قالین بچھا دیکھا

سنا ہے میں نے اک سیّاح یورپ کو بھی یہ کہتے
مقام اس نے نہ دنیا بھر میں ایسا خوشنما دیکھا

پیرزادہ عارف کو شعر گوئی اور اس کے فنی لوازمات پر مکمل عبور حاصل ہے۔انھوں نے صرف وادی کے قدرتی مناظر کا ہی مشاہدہ نہیں کیا بلکہ عوام کے درمیان رہ کر ان کی طرز زندگی، تہذیب وتمدن کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کو درپیش مسائل کا حل پیش کرتے ہوئے اسے ایک بہترین منظوم سفرنامہ میں قلمبند کیا ہے۔احوال سفر کو منظوم انداز میں قلم بند کرنا مشکل ترین امر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اردو ادب کے صنف سفرنامہ میں یہ تکنیک آج بھی بہت کم رائج ہے۔کیونکہ ہر ایک منظر کو شعری پیرائے میں پیش کرنا اور شعری محاسن کو برقرار رکھتے ہوئے ہر ایک واقعہ اور منظر کو منظوم کرنا اور فن شاعری کے لوازمات و امکانات اور ضروریات کا خیال کرتے ہوئے ہر ایک واقعے کو تسلسل کے ساتھ شاعری کے قالب میں ڈھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔یہ وہی کر سکتا ہے جسے شاعری اور علم کلام پر قدرت کاملہ ہو، منظر نگاری اور جزئیات نگاری کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہوں اور الفاظ کے انتخاب پر پوری مہارت ہو۔پیرزادہ عارف کو اس فن میں دسترس حاصل ہے۔ان میں زبان و بیان کے کمال کے ساتھ ساتھ یہ تمام فنی محاسن بدرجہ اتم موجود ہیں سفرنامہ کا فن مصنف سے وسعت نگاہ، گہرا مشاہدہ، پختہ تجربات اور وسیع علم وآگاہی کی طلب کرتا ہے۔اس سفرنامے کے مطالعہ سے پیرزادہ عارف کے اس فن میں کمال دسترس کا احساس ہوتا ہے۔

الختصر پیرزادہ عارف نے اپنے سفر کی روداد کو منظوم کیا اور اس طرح ریاست میں لکھا گیا پہلا منظوم سفرنامہ معرض وجود میں آیا۔من جملہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کشمیر کا قدیم منظوم سفرنامہ ''آئینۂ کشمیر'' یا ''خطۂ بے نظیر کشمیر'' اردو کا ایک قدیم اور اہم منظوم سفرنامہ ہے اور جموں وکشمیر میں لکھا جانے والا پہلا منظوم سفرنامہ ہے۔اس سفرنامے میں تاریخی، جغرافیائی، سیاسی، معاشرتی، سماجی حالات، تہذیب وتمدن اور عوام وخواص دونوں کی زندگیوں کو سفرنامہ نگار نے اپنے مشاہدے کی روشنی میں منظوم کیا ہے۔یہ سفرنامہ ادبی سرمائے میں محض ایک اضافہ ہی نہیں بلکہ کشمیر کی تاریخ، سماج اور سیاسی مسائل کو سمجھنے کے لیے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

□□□

Sara Batool
Turtuk Nobra
Leh Ladakh-194401
Email: sarahashour33@gmail.com

ڈاکٹر ہاجرہ خاتون

دسمبر بارش اور تم

بارشوں کے موسم میں
روحیں کیوں تڑپتی ہیں
حسرتیں کون پالتا ہے
خواہشیں کیوں مچلتی ہیں
درد کے سمندر میں
دل کیوں ڈوب جاتا ہے

گمشدہ ساعتوں کو
آواز بنالینا۔۔۔۔
دامن کو بھگو لینا
میری جاں
محبتیں جب مرجائیں
تم بھی تھوڑا رو لینا

زندگی خوبصورت ہے

مجھے ہمیشہ لبھاتے رہے ہیں
یہ ڈالی
یہ پتے
مہکتے پھول
اور بارش
بدلتے موسم
یہ کہرے
یہ بھاپ
یہ نیلگوں
آسماں
دسمبر کا موسم
اور خود سے میری دوستی
کتابوں کی سنگت
بھاپ اڑاتی کافی
زندگی کس قدر
مکمل اور خوبصورت ہے
اے خدایا

Dr. Hajra Khatoon
1C Zuleikha Enclave,
Parastoli, Doranda,
Ranchi-834002 (Jharkhand)
Mobile 9430254770

شیبا کوثر

امید کا دیا

الجھی یادیں بکھرے خواب
آنکھوں میں ویرانی ہے
اور دل میں حیرانی ہے
برف کی چادر پر بیٹھی
گم ہے یادوں کے درپن میں
پھر آنکھوں سے برسات ہوئی
جیون کی آنکھ مچولی میں
اس کی مات ہوئی
دور گگن سے
ایک پرندہ آتا ہے
پریم کے نغمے گاتا ہے
دل پھر یہ سمجھاتا ہے
عشق کوئی کھیل نہیں
اس کا میرا میل نہیں
میں تو باسی پریم نگر کی
وہ حرص و حوص کا مارا ہے
ایک سرد ہوا کے جھونکوں نے
دل کے شعلوں کو
یخ کر ڈالا ہے
پھر خواب آنکھوں میں
جاگنے والا ہے
اور امید کا دیا پھر سے
آنکھوں میں
روشن ہونے والا ہے!!

خواب

جاگتی آنکھوں سے زندگی کے لیے
کچھ خواب بنے ہیں میں نے
جن کی خاطر مسلسل رہ گزر میں
سرگرداں و پریشاں رہتی ہوں
لہجوں کا بھی طنز سہتی ہوں
لیکن مگن میں اپنی منزل میں
تشنہ و تنہا رہتی ہوں
اکثر میرے دل سے یہ سدا آتی ہے
کہیں دور سے ایک ندا آتی ہے
کیا یہ خواب حقیقت ہوں گے
کہاں ہوں گے کیسے ہوں گے کب ہوں گے
صبر کہتا ہے ہاں ہوں گے اب ہوں گے
حوصلہ میرے اندر مکین ہے
خود پہ اعتماد ہے یقین ہے
اور ذاتِ خدا پر بھروسہ ہے مجھ کو
دعا دے کے ماں نے پوسا ہے مجھ کو

Sheeba Kausar
Mohalla: Brah batrah
Post: Arrah
Dist: Bhojpur-802301 (Bihar)

عصمت آرا

گیت

پاگل بن کا مور رے سجنی
نس دن کرتا شور رے سجنی

جنم جنم کا تجھ سے ناتا
پھر بھی من کاہے گھبراتا
سڑکیں سونی،سونی گلیاں
آیا ہوں میں ٹھوکر کھاتا

پاگل بن کا مور رے سجنی
نس دن کرتا شور رے سجنی

دیکھ ذرا یہ رت مستانی
مہک رہی ہے رات کی رانی
کیسے میرا من نہ مچلے
رم جھم برس رہا ہے پانی

پاگل بن کا مور رے سجنی
نس دن کرتا شور رے سجنی

پیت کی تیرے کٹھن ڈگر ہے
اس میں بھی آنند مگر ہے
اس کی کسک بھی میٹھی میٹھی
گھائل تن من جان جگر ہے

پاگل بن کا مور رے سجنی
نس دن کرتا شور رے سجنی

مان بھی جا اب میری رانی
بول دے تو بھی پریت کی بانی
عصمت ہے بانہیں پھیلائے
آج نبھا دے پریت پرانی

پاگل بن کا مور رے سجنی
نس دن کرتا شور رے سجنی

Ismat Ara
Flat No.306,T.Khan Complex
Near Gandhi Maidan
AzadNagar,Mango
Jamshedpur-832110 (Jharkhand)

سیدہ ایمن عبدالستار

آخری کوشش

''یہ کیا حلیہ ہے بچی کیا شریف گھرانوں کی لڑکیاں ایسا لباس ایسا پیراہن ایسا حلیہ کرتی ہیں۔صنف نازک تو ہے ہی حیا کا مجموعہ نزاکت کا پیکر شرم کا دریا پوری طرح سے چھپی ہوئی، کوئی مرد نظر اٹھا کر دیکھے تو دوسرے ہی لمحے اس کی نظریں گھبرائی لجائی لڑکی کے پسینہ سے شرابور ماتھے سے وضو کرتی واپس لوٹے تو معطر ہو کر..!!''

دادی اماں نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا چست شرٹ جس کی آستین غائب تھی اس پر ٹائٹ چوری دار پاجامہ پہن رکھا تھا۔دوپٹہ پٹے کی طرح گلے میں لپیٹ رکھا تھا۔اس کے جسم کے جوان نشیب و فراز ہر زاویے سے ابھر کر واضح ہو رہے تھے۔

''وہ دقیانوسی زمانہ تو گیا دادی کس وقت کی باتیں لے کر بیٹھ گئی ہیں اس زمانے میں عورتوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔اب عورت آزاد ہے جو چاہے کر سکتی ہے۔کون سا کام ہے جو آج کے زمانے کی عورت نہیں کر سکتی تو یہ پردہ چادر جیسی باتیں کتنی گھٹیا اور بے کار لگتی ہیں۔'' دادی اماں اپنی پوتی کی بدتمیزی سے جواب دینے پر خاموش ہو گئی۔

''دادی اماں ناراض کیوں ہوتی ہیں وہ سننے والی کہاں ہے..!!! آپ چلیں شام کی چائے برآمدے میں پیتے ہیں...!!'' نزہت نے نرمی سے دادی ماں کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لیا ثروت باہر جا چکی تھی اسی طرح اٹھلاتی ہوئی ،اس کے برعکس نزہت تھی سیدھی سادی نرم مزاج سمجھدار لڑکی جسے نماز روزہ سے عشق تھا۔اللہ کا خوف ہر وقت ذہن میں رہتا تھا والدین کی خدمت کے ساتھ کالج کی پڑھائی میں بھی مصروف رہتی تھی دادی ماں کو اپنی پوتی ثروت سے ،بہت محبت اور لگاؤ تھا۔

دادی ماں گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتی ہوئی ماضی میں ہلکورے لے رہی تھی سَر سے گردن تک گھونگٹ لیے بڑے بڑے دالانوں والے گھروں میں دن رات ان گنت کام کرتی خواتین کتنی خوش مزاج رہتی تھی۔

ہر دن کے حساب سے کام طے تھے سارے کام گھر کی خواتین مل جل کر کرتی تھیں۔ایک دوسرے سے ہزار شکوے سہی لیکن اچھے برے وقت میں وہ ہر دم ساتھ رہتے تھے پہلے مہینوں کے حساب سے ملاقاتیں ہوتی تھیں لیکن دلوں میں خلوص محبت اپنائیت چاہت عزت ہوتی تھی۔

لکڑی جلا کر چولہوں پر کھانا پکتا تھا وہ لذت کہاں ہے فاسٹ فوڈ میں۔آنگن کا ایک کونا ہی باورچی خانہ تھا اور اس کے ساتھ ہی جڑا ڈائینگ روم جس میں ماں بیٹھے بیٹھے ہی سارے گھر کا کھانا پکاتی بھی تھی اور پروستی بھی تھی۔

اس سادگی میں بھی انوکھا لطف تھا کئی ہفتوں میں کسی خیر خواہ کا خط آتا تو گھر والوں کی خوشی کے ساتھ محلہ بھر خوش ہوتا، خیر خیریت کے ساتھ دعاؤں سے نوازا جاتا۔

لوگ بھی سادہ تھے، جذبات بھی کھرے، کھانا بھی خالص اور لوگ بھی صحت مند کسرتی تھے، خواتین کی دنیا گھر ہی تھی سارا کنبہ ایک نئی نویلی دلہن کی ذمہ داری بن جاتا تھا راتوں رات وہ کئی رشتوں سے بندھ جاتی تھی۔ اس زمانے میں بڑوں کا ادب چھوٹوں سے محبت کی جاتی تھی کسی کے والدین یا ساس سسر بوجھ نہیں تھے بلکہ وہ گھر کے سب سے اہم افراد میں شامل رہتے جن سے کنبہ چلتا تھا ان کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی قدر و منزلت خود اولاد نے گھٹا کر "کام والی بائی" سے لے کر "سر درد" بنا دی۔ ایسے کچھ ہی بچے جنھوں نے اس ثقافت کی ڈور کو سنبھالا دے کر بچانے کی ناکام سی کوشش کی تھی۔

دادی اپنی سوچوں میں ہی تھی کہ عجیب سا شور گلی میں اٹھا تھا خواتین کے ساتھ کسی کی چیخیں بھی تھی۔ ثروت نے جلدی سے بڑی سی چادر میں خود کو لپٹا یا اور گیٹ کی طرف دوڑی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

دادی ماں نے عینک درست کی اور گیٹ کی طرف دیکھا وہ نزہت ہی تھی اس کا نیا لباس جو وہ کچھ دیر پہلے بن سنور کر گئی تھی جگہ جگہ سے پھٹا تھا۔ سلیقے سے جمے بال مٹی میں اٹے پڑے تھے چہرے کا میک اپ آنسوؤں میں بہہ کر اس کی صورت بگاڑ رہا تھا۔

" لو سنبھالو اپنی بچی کو علی خان کے غنڈے سڑک سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ کسی کی دعا کام آ گئی اور یہ شور مچانے سے بچ گئی ورنہ اللہ ہی مالک تھا..!!" ایک خاتون نزہت کو ثروت کی طرف دھکیلتی ہوئی طنزاً بولی اور یہ مختصر سا کارواں گیٹ کے باہر جمع ہو گیا۔ ثروت نے اپنی چادر نزہت کے کانپتے جسم پر ڈالی اور گیٹ بند کر کے تیزی سے نزہت کو اندر لے گئی۔

دادی اماں ہانپتی کانپتی اندر آئی جہاں ان کی بہو جہاں آرا باوجود ضبط کے باآواز رو رہی تھی کبھی نزہت کو مارنے لگتی کبھی خود ہی منہ چھپا کر روتی نزہت الگ بے جان سی پڑی تھی، ثروت ماں کو تسلی دے رہی تھی۔

جہاں آرا کو کہاں آزادی تھی کسی محرم کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کی یا گھر کی خواتین کی اجازت کے بغیر نکلنے کی ہمت کہاں تھی، ان پر پابندیوں کے ساتھ ساتھ نظروں کے بھی پہرے تھے جو انھیں بہت برے لگتے تھے وہ تو آزاد رہنا چاہتی تھی دل کی چاہتوں کے پنکھ لگا کر اڑنا چاہتی تھی لیکن یہ کبھی ممکن نہیں ہوا تھا گو کہ وہ ایک معزز گھرانے کی بیٹی عزت دار گھرانے کی عزت تھی لیکن ایک انسان بھی تھی۔ انھیں ہر وقت گھر میں رہنا قید لگتا تھا۔

وہ نیا دور تھا جب کچھ ہی گھروں میں ٹیلی فون نصب تھا گھنٹی بجتی تو سارے گھر میں بھگدڑ مچ جاتی فون کو سننے کے لیے خواتین میں افراتفری مچ جاتی۔ ٹیلی ویژن پر صرف ایک ہی چینل چلتا تھا۔ ہر ہفتے کی چھٹی پر محلے کے سارے بچے ٹیلی ویژن والے گھر جمع ہوتے اور بڑی عقیدت سے ٹی وی کو دیکھا جاتا۔

کسی کسی کے پاس کار تھی جب بھی محلے کی چھوٹی سی گلی میں کار آ کر رکتی سارے بچے جمع ہو کر اس کو ایسے دیکھتے جیسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ ان کی نظروں کے سامنے کھڑا ہو۔ خواتین مکچر اور اوون پا کر ہی خود کو امیر ترین تصور کرتی تھی تین کمرے کے گھر میں خود کو ملکہ تصور کرتیں۔

اپنی خواہشوں کے سامنے شوہر سے زبان درازی بھی کرنے لگی تھی نئے دور نے انھیں بھی تو آزادی کے پنکھ میسر کیے تھے ان کے لیے بھی قانون بنے تھے ان کے حقوق نسواں کا حق انھیں دیا گیا تھا

جہاں آرا اپنے اوپر ہوئے ظلم کی کہانی اولاد پر کیسے دوہراتی انھوں نے اسے آزادی کے پنکھ دیے تھے اڑنے کے لیے اسے اس کا حق دیا گیا تھا۔

> **"باجی کا انجام دیکھ کر جہاں آرا نے سبق لیا اس میں سب سے زیادہ کردار تو اماں کی محبت اور درگزر کرنے والی صفت کا تھا جنھوں نے اسے اس کی غلطیوں نافرمانی اور سرکشی پر معاف کر کے اپنا لیا تھا ورنہ وہ بھی آج باجی کی طرح اماں کی چوکھٹ پر پڑی بھانجوں کے طعنے بھائیوں کی بے رخی اور خاندان بھر کی بے عزتی برداشت کر رہی ہوتی بروقت انہیں خدا نے بچا لیا تھا جس کے لیے وہ اماں کی ممنون تھی"**

ایسا حق تو ان کی بہن نے بھی حاصل کیا تھا شوہر سے زبان درازی ساس سسر کی نافرمانی نندوں سے جھگڑا، دیور کے ساتھ جھگڑے آئے دن کا نیا شوشہ علیحدہ گھر کی خواہش، غیر ضروری چیزوں کی لمبی لسٹ، غریب شریف معمولی نوکری کرنے والے بھائی جان جن پر اپنے سارے کنبہ کی ذمہ داری تھی ان کی خواہشات کا بھاری بوجھ زیادہ دنوں تک اٹھا نہیں سکے اور باجی کو طلاق دے کر فارغ کر دیا۔

باجی کا انجام دیکھ کر جہاں آرا نے سبق لیا اس میں سب سے زیادہ کردار تو اماں کی محبت اور درگزر کرنے والی صفت کا تھا جنھوں نے اسے

اس کی غلطیوں نافرمانی اور سرکشی پر معاف کر کے اپنا لیا تھا ورنہ وہ بھی آج باجی کی طرح اماں کی چوکھٹ پر پڑی بھانجوں کے طعنے بھائیوں کی بے رخی اور خاندان بھر کی بے عزتی برداشت کر رہی ہوتی بروقت انھیں خدا نے بچا لیا تھا جس کے لیے وہ اماں کی ممنون تھی۔

محلہ کے معززین معز صاحب کے ساتھ ہی داخل ہوئے تھے دوسرے ہال میں خواتین بھری بیٹھی تھیں، پردہ کا اہتمام تھا کچھ ہی دیر میں علی خان جو اس علاقے کا سربراہ غنڈہ تھا اسی کے بیٹے نے ایسی حرکت کی تھی اپنے بیٹے کو گھسیٹتا مارتا لے کر آ گیا ہر طرف گہرا سناٹا چھا گیا۔

''ہم غنڈے ہیں برے لوگ ہیں مانتے ہیں لیکن کسی عزت دار گھرانے کی لڑکی کے ساتھ ایسی حرکت نہیں کی یہ پہلا موقع ہے کہ ایسا ہوا ہے...!!'' علی خان نے کالے رنگ کا پٹھانی شرٹ شلوار پہن رکھا تھا اونچا لانبے قد کے ساتھ جسم بھی ڈیل ڈول تھا بڑی سرخ آنکھوں میں سرما لگا تھا سلیقے سے جمے بالوں میں چمبیلی کے تیل کی خوشبو مہک رہی تھی پان چباتے ہوئے اس نے گرجدار آواز میں کہا۔

''علی بھائی یہ شریفوں کا محلہ ہے یہاں یہ سب نہیں چلے گا ہر گھر میں بچیاں خواتین ہیں اس طرح سے تو ہمارا جینا مشکل ہو جائے گا...!'' محلے کے ایک معزز نے پھڑک کر کہا علی خان نے اسے گھورا تو وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔

''آج کل انٹرنیٹ کا زمانہ ہے فحاشی بالکل عام اور سیدھے ہاتھ میں موبائل کی شکل میں موجود ہے اور یہ نوجوان لونڈے ہیں ان کو بھلا کیا کوئی روک سکتا ہے۔ میں مانتا ہوں میرے بچے کی غلطی ہے اور میں اسے سزا بھی دے چکا ہوں اور آپ بھی دینا چاہیں تو اس کی سزا تجویز کر دیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن....!!

''اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا..!!'' علی خان کی بات پر بپھرا اٹھتے کئی سر الجھ کر اسے دیکھنے لگے

''تو کیسے ہوگا حل..!!'' کسی نے پوچھا۔

''اس کا حل تو آپ سب شریفوں کے پاس موجود ہے صاحبوں !!'' علی خان نے سب کو حیرت میں ڈالا سبھی بھونچکا سے رہ گئے اس کے بیٹے نے بھی سر اٹھا کر حیرت سے دیکھا۔

''میں ایک ان پڑھ گنوار غنڈہ محلے کا کوڑا دان ہوں لیکن آپ شریف لوگ ہیں غیرت مند لوگ ہیں کیا آپ اپنی بہن بیٹی بیوی کو عزت سے نہیں رکھ سکتے۔ کیا انھیں سر پر دوپٹہ چادر ڈال کر نکلنے کی تہذیب نہیں سکھا سکتے جب کوئی لڑکی یہ چست لباس پہنے سجی سنوری خوشبوؤں میں بسی اٹھلاتی ہر روز سامنے سے گزرے گی تو اس بچے کا کیا کسی بھی راہ چلتے کی نیت بدل جائے گی۔''

''ہم مسلمان ہیں کیا یہی ہمارا دین ہے یہی ہمارا مذہب ہے بچیوں کو پردے کا پابند کریں مانا کہ ہماری غلطی گناہ کے برابر ہے لیکن غور طلب بات ہے کہ یہ واقعی دوسری کسی بچی کے ساتھ نہ ہو کر اس بچی کے ساتھ ہی کیوں ہوا''

''دوسری بچیاں جبکہ اس کی سگی بہن ہی چادر میں لپٹی کئی بار آتی جاتی ہے یہ بندہ خدا اسے دیکھتا بھی نہیں جس چیز کو چھپا کر رکھنے کا حکم ہے اس کی پیروی کیوں نہیں کرتے...!'' علی خان کی بات پر سب ہی خاموش ہو گئے۔ علی خان کے بیٹے پر محلے میں آنے کے لیے پابندی لگائی گئی ساتھ ہی جہاں آرا نے نزہت کا باہر نکلنا بند کر دیا اگر وہ نکلتی بھی تو پورے پردے کے ساتھ جاتی تھی۔

اس کے لیے ایک ہی سبق کافی تھا اس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد ثروت کی پھوپھو نے اسے مانگ لیا جہاں آرا شش و پنج میں مبتلا ہو گئی ان کا ارادہ نزہت کے لیے تھا لیکن محمود نے ثروت کے لیے ہامی بھری تھی۔

''ثروت ہو یا نزہت ہو دونوں ہی تمھاری اپنی بیٹیاں ہیں اتنا کیوں سوچتی ہو بسم اللہ کرو....!!'' اماں نے سمجھا کر جیسے فیصلہ سنا دیا جہاں آرا نے رسماً منگنی کر لی تھی نزہت کے ساتھ ہی دونوں سے فارغ ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔ نزہت کے خواب بہت اونچے تھے وہ خود بھی خوبصورت اور حسین تھی تو اسے بھی اپنے برابری کا شریک حیات چاہیے تھا۔ وہ اکثر محمود کے سانولے رنگ کے طعنے ثروت کو دیتی رہتی تھی یہاں تک کہ وہ اسے منگنی توڑنے کے بھی ٹوٹکے سکھاتی رہتی تھی۔ پھوپھو نے اس کے بجائے ثروت کو فوقیت دی تھی اس کا بدلا وہ اس طرح لینا چاہتی تھی، وہ تو پہلی فرصت میں محمود کو انکار کرنے والی تھی لیکن یہاں معاملہ الٹا ہو گیا محمود نے اسے پرپوز ہی نہیں کیا۔

اس کی انا پر بہت بڑی چوٹ تھی جس پر وہ ہر وقت تلملاتی رہتی تھی۔ ثروت والدین کے فیصلے پر خوش اور راضی برضا تھی پھوپھو کے مزاج کو بھی وہ سمجھتی تھی اور محمود کی سنجیدگی بردباری اسے پسند تھی وہ ہر طرح سے مطمئن تھی۔

نزہت نے اپنے لیے اچھی جاب اور وجیہ پرسنالٹی والے زبیر کو چن لیا تھا۔ جہاں آرا نے شکرانے ادا کیے اور دونوں کی تاریخ طے کر دی۔ تاریخ 3 اکتوبر نکالی گئی تھی نزہت کی فضول خرچی عروج پر تھی ہر چیز جیسے اس کے لیے آخری تھی۔

’’ہمارا بیاہ جب طے ہوا تھا تو تاریخ 13 اکتوبر نکلی تھی ہفتہ کا روز تھا سیدھے سادے لوگ تھے کارڈ پر تاریخ لکھی دیکھی کچھ نے تو 3 اکتوبر سمجھ لیا کوئی ٹرین سے کوئی بس سے جمعرات کو ہی شادی سمجھ کر پہنچ گیا کوئی جمعہ کے دن اکثر نکاح کرتے تھے جمعہ کے دن تیار ہو کر آ گئے اتنے سادہ تھے جمعہ کی ہی شادی سمجھے...!‘‘

دادی اماں اپنی یادیں بتانے لگی تو ثروت ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئی نزہت بھی مسکرانے لگی۔

’’دادی ماں 13 اکتوبر کی لکھاوٹ ہی کچھ ایسی ہے کہ کوئی بھی اسے 3 سمجھ کے دھوکا کھالے...!!‘‘ ثروت نے ہنستے ہوئے کہا ۔

’’جانے ہماری شادی پر لوگ کون سی تاریخ سمجھیں گے اور جانے کب پہنچیں گے..!!‘‘ نزہت شوخی سے بولی تو سبھی ہنس پڑے۔

اس نئے دور میں مہمان کہاں شادی کا کام بٹانے آتے ہیں شادی والے گھر میں رکنا فرسودہ خیال بن کر رہ گیا ہے۔ ساری تیاری لڑکی یا لڑکے کے والدین کے ذمہ ہو گئی ۔ مہمان سیدھے تیار ہو کر شادی ہال میں آتے ہیں۔ ان دنوں جیسی محبت نہیں رہی خلوص اور عزت اب کہی باقی نہیں رہا بس دور سے ہی سلام دعا خیر خیریت اجنبیوں کا سا رویہ دعوت تمام رشتہ داری کا فریضہ انجام ہو گیا۔

نزہت تیسرے نمبر کی بہو تھی اور چاہتی تھی کہ سب اس کے ناز نخرے اٹھائیں زبیر شروع شروع میں اس کے رویہ پر سمجھاتا درگزر کرتا جسے نزہت اپنی جیت سمجھ کر ہٹ دھرمی پر آ جاتی زبیر سے اونچی آواز میں بولتی زبیر نہیں چاہتا تھا کہ ان کی چپلقیش گھر بھر کے لیے پریشان کا باعث بن جائے ان باتوں سے نزہت کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

نہ تو وہ گھر کے کسی کام کو ہاتھ لگاتی نہ خوش اخلاق ساس نندوں اور بھابیوں کو منہ لگاتی۔ کچھ ہی دنوں میں سب اس سے بیزار رہنے لگے نزہت کی خود پسندی کسی طور کم نہیں ہوتی تھی بات بے بات وہ زبیر سے روٹھ کر مائیکے آ جاتی اور زبیر کو اسے منانے کے لیے سو جتن کرنے پڑتے تو تو میں وہ بھی اس کے آس انداز و اطوار سے پریشان ہو گیا تھا چھ ماہ بعد ہی وہ نزہت کے رویہ سے مایوس ہوا تو اس نے اس مسئلہ پر جہاں آرا سے بات کی۔ وہ حیرت سے زبیر کا منہ تکنے لگی۔

’’دیکھیں آنٹی ہماری فیملی شادی سے پہلے بھی جوائنٹ فیملی ہی تھی سب کو اپنے اپنے بلاک دے رکھے ہیں پاپا نے، نہ بہنوں کی منت سماجت ہے نہ میرے والدین کی خدمتیں ہیں دوسری بھابیوں کے سر پر ساری ذمہ داری ہے۔ صبح نو بجے سے پہلے یہ اٹھتی نہیں میں آفس نکلتا ہوں تو کسی بے ضرر سی بات پر جھگڑا کرتی ہے میری برداشت اب ختم ہو گئی ہے میرے والدین اور گھر کے لوگ اس سے بیزار ہیں..!!‘‘ زبیر نے چڑ کر کہا اور دروازے سے نکلتا چلا گیا نزہت سرخ بھبھوکا چہرہ لیے کھڑی رہ گئی۔

’’میں نہ کہتی تھی دلہن پہلی اولاد کا شرف حاصل ہوا ہے تو بے جا خواہشات کو پورا کروانا اس کا حق تھوڑی ہو گیا....!!‘‘ اماں نے سختی سے کہا جہاں آرا خاموش بیٹھی رہی۔

انھیں تو ثروت کی فکر تھی اس کی پھوپھو اتنی تیز مزاج تھی اور محمود اتنے خاموش مزاج کبھی کبھی تو وہ ہول جاتی تھی کہ ان کی معصوم سی ثروت کا کیا ہو گا۔ اس کے برعکس ثروت نے سمجھداری کا ثبوت دیا اس نے پھوپھو کا مزاج نرم کر دیا محمود کے ساتھ ساتھ اپنی کزن اور سارے گھر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اتنے کم وقت میں اس نے گھر کی ساری ذمہ داریاں اپنے نازک کندھوں پر اٹھا لی جب بھی آپا اس کے ساتھ ملنے آتی تھی کتنی تعریفیں کرتی کتنی معتبر بن گئی تھی وہ اپنی نند کی نظروں میں ثروت کی خدمت محنت اور سمجھداری سے۔

نزہت کی ناراضگی والی بات کو حتی الامکان چھپانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں ایک دن جہاں آرا کا صبر ٹوٹا تو ثروت کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

’’اگر تم امی کی دکھ بھری باتیں سن کر مجھے زبیر سے معافی مانگ کر واپس اس گھر میں جانے کی بات کرنے آئی ہو تو ادھر سے ہی واپس لوٹ جاؤ میں کسی کی بات نہیں سننے والی‘‘ نزہت کا دوٹوک لہجہ سن کر ثروت مسکرائی۔

’’آپا کیسی باتیں کرتی ہیں آپ...!!! میں کیوں آپ کو سمجھانے لگوں گی آپ مجھ سے بڑی ہیں آپ کو مجھے سمجھانا چاہیے میں تو آپ کو ثمرہ کی منگنی میں لینے آئی تھی آپ نے اتنی اچھی شاپنگ کی تھی شادی میں۔ ثمرہ کو بہت پسند آئی تھی اور پھوپھو بھی تمھیں بہت یاد کرتی ہیں اور کچھ دن میرے ساتھ رہو گی تو دل بھی بہل جائے گا...!!‘‘ ثروت نے نرم و شہد آگیں لہجہ میں کہا تو نزہت ایک دم خاموش ہو کر اپنے سخت رویہ پر شرمندہ ہو گئی۔

آناً فاناً وہ اس کے ساتھ جانے تکو یار ہو گئی تھی جہاں آرا کو ثروت نے خوب تسلی دی تھی کچھ ہی دنوں میں نزہت کو اندازہ ہو گیا کہ ثروت اس گھر میں کتنی اہم فرد ہو گئی ہے۔ وہ پانچ منٹ بھی غائب ہوتی تو سارا گھر درہم برہم ہوتا محسوس ہونے لگتا تھا وہ محمود کی کم صورتی کے باوجود اس کا سب سے زیادہ خیال رکھتی تھی۔ صبح ہر چیز اس کے ہاتھ میں تھماتی اس کا ناشتہ پورے دھیان سے بناتی دیگر افراد کا بھی ساتھ ہی خیال رکھتی تھی۔

شام کو محمود کی واپسی کے وقت وہ بن سنور کر خوشبوؤں میں بسی اس کا استقبال کرتی وہ منٹوں میں فریش لگنے لگتا پھو پھوبھی اس سے بہت خوش تھی دونوں کزنز ثمرہ اور عرفی تو اس کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔

وہ بھی اس کے کام نپٹانے میں پوری مدد کرتی تھیں ثروت کے منہ سے بات نہ نکلتی اور وہ کام کرنے کو تیار رہتی۔ گھر چار کمروں پر مشتمل تھا چھوٹا سا آنگن تھا لیکن سب اتنی ہنسی خوشی سے رہتے تھے وہ ساری آسائشات ثروت کو میسر نہیں تھی جن کا ڈھیر زبیر نے اس کے لیے لگا رکھا تھا لیکن ثروت پھر بھی شوخ تتلی بنی پھرتی تھی محمود اس کے گرویدہ اس کا سارا گھر اس کی محبت وخلوص سے چور چور تھا۔

ثروت کو اپنے گھر سنسار کی ذمہ داری نبھاتے دیکھ نزہت کو دل میں چبھن ہونے لگی اس نے کب کسے اہمیت دی تھی۔ جاتے وقت تو زبیر کو ناراض کرتی تھی واپسی پر تو پورا جھگڑا کرتی تھی وہ تھکا ہارا آفس سے گھر کے بجائے کہی اور جانے لگا تھا۔ اس کا سامنا کرنے سے بچنے لگا تھا ثمرہ کی منگنی تو اس نے جیسے تیسے کی تھی اس کا سارا دل زبیر کی طرف کھنچنے لگا تھا وہ جلد ہی اپنے فیصلہ پر پہنچ گئی اسے پہنچنے میں بہت وقت لگا بہت روئی تھی اپنی نادانی پر۔

''ثروت میری گڑیا...!! تم نے بڑی اچھی بات کی مجھے یہاں اپنے پاس لے آئی اور پریکٹیکل بتایا کہ ازدواجی زندگی کو جیتے کیسے ہیں تعلقات کو نبھاتے کیسے ہیں میں اپنی انا میں اتنی خودغرض ہوگئی تھی کہ مجھے اللہ کی دی ہوئی نعمتیں نظر ہی نہیں آرہی تھیں۔ خدا تمھیں خوش رکھے آباد رکھے میرے سارے راستے تم نے آسان کیے ورنہ میں بھی خالہ عرشیہ کی طرح اپنی زندگی برباد کر کے مائیکے کی چوکھٹ پر تمام عمر گزار دیتی۔''

نزہت کی بات سن کر ثروت نے اسے لپٹا لیا جہاں آرا نے ساری باتیں سن لی تھی وہ شکرانے کے سجدے میں گر گئی اماں نے دونوں پوتیوں کو سکھی سنسار کی ڈھیروں دعائیں دی۔

''دادی اماں ..!! مجھے معاف کریں میں آپ سے ہمیشہ زبان درازی کرتی رہی آپ نے مجھے ہمیشہ محبت اور خلوص سے رکھا..!'' وہ جاتے ہوئے دادی سے لپٹ گئی جب سے وہ ثروت کے پاس سے آئی تھی دادی کا پورا خیال رکھ رہی تھی ۔ والدین کو وقت دے رہی تھی گھر کی ذمہ داری اٹھانے لگی تھی زبیر اس کا فون اٹینڈ نہیں کر رہے تھے وہ تو رو کر اپنے خدا کے حضور سربسجود اپنی غلطیوں کی معافی مانگ رہی تھی۔

نزہت کے والدین نے زبیر کی امی سے رابطہ کیا اور سارا معاملہ کہہ دیا زبیر کی امی شام کو ہی زبیر کو لے کر گھر پہنچ گئی۔

''یہ ایسی بات تو نہیں ہے جس سے زندگی بھر کا تعلق توڑ دیا جائے، بچے ناسمجھ ہوتے ہیں انھیں اچھے برے کی سمجھ ہمیں ہی سکھانی ہے زبیر سے میں ناراض ہوں اتنی بڑی بات ہوئی اور اس نے بتانا بھی گوارا نہیں کیا جھگڑے کن میاں بیوی میں نہیں ہوتے یہ ایسا بڑا مسئلہ بھی نہیں ہے'' زبیر کی امی سمجھانے لگی ثروت نے موقع دیکھ کر نزہت کو اشارہ کیا نزہت اپنی ساس کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنے لگی۔ اداس اداس سے زبیر کے لیے یہ حیرت انگیز بات تھی وہ ہونقوں کی طرح نزہت کو دیکھنے لگا اس کے اس قدر بدلاؤ پر وہ کھل اٹھا تھا۔

نزھت نے اس سے بھی معافی مانگی تھی وہ بالکل بدل گئی تھی اب گھر کے معاملات میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کو بھی سنبھال رھی تھی زبیر کے والدین کی مکمل ذمہ داری اس نے لے لی۔

نزہت نے اس سے بھی معافی مانگی تھی وہ بالکل بدل گئی تھی اب گھر کے معاملات میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کو بھی سنبھال رہی تھی زبیر کے والدین کی مکمل ذمہ داری اس نے لے لی۔

اس کی اس کایا پلٹ پر سبھی حیران تھے اب جب بھی نندیں آتی وہ کچن میں گھسی کچھ نہ کچھ نیا بنانے کی کوشش کرتی نندیں بھی اس کی دیکھا دیکھی کچن میں گھس جاتی اور اچھی خاصی ہنسی مذاق کی محفل کچن میں جم جاتی۔

بچیوں کو یوں چہچہاتے دیکھ زبیر کے والدین بہت خوش تھے اور زبیر تو نہال سا ہوجاتا تھا بڑی بھابھی کبھی کبھی تلخ ہونے لگتی تو نزہت ان کے سامنے دھرنا دے کر بیٹھ جاتی۔

''دیکھیں بھابھی مجھ سے غلطی ہوئی ہے تو صاف کہیں دو تین تھپڑ لگا لیں میں چھوٹی ہوں آپ سے لیکن یہ طعنے تشنے تلخی نہیں چلنے والی بھابھی!'' نزہت کی بات پر بھابھی چپ ہوجاتی بات کو پلٹ دیتی لیکن دھیرے دھیرے وہ بھی نرم ہوتی گئیں حالات سدھرتے گئے اور نزہت نے اپنی منزل پالی۔

□□□

Syeda Aiman Abdus Sattar
Al-Hayat Apartment No. 1
Riyaz Colony
Take Nagar Juna Renapur Naka
Latur-413531(M.S)

کہانی

ڈاکٹر فاطمہ خاتون

پھر اس کے بعد

''میں نے کہہ دیا امی آپ مجھے اور پریشان نہ کریں۔''

روبی تکیہ میں منھ چھپائے آج پھر اپنی امی سے تکرار کر رہی تھی۔ اس تکیہ نے ایک آہنی دیوار کی طرح اک متلاطم بحر ذخار کو اپنے اندر دبائے رکھا تھا۔ روبی اپنی آنکھوں کے سیلاب کو تکیے میں جذب کیے جا رہی تھی۔

''یہ لڑکی کب سمجھے گی۔ میں مر جاؤں گی تو کوئی پوچھنے والا نہ ہوگا۔''

رحیمہ غصے میں کانپتے ہوئے اپنی بیٹی کو ڈانٹ رہی تھی۔ مگر یہ غصہ ماں کی ممتا ہی کا ایک حصہ ہے جو اپنے بچوں کی بھلائی کے لیے اس پر ہی پھوٹ پڑتا ہے۔ ماں اور بیٹی میں اکثر یہ تکرار ہو جاتی تھی۔ روبی نے جب سے اپنی زندگی کی 25 ویں بہاریں گزار کر 26 ویں سال میں قدم رکھا تھا۔ بس تب ہی سے رحیمہ کو اپنی اکلوتی بیٹی کی شادی کی فکر اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی۔

''میں نے کہہ دیا نا امی.... میں شادی نہیں کروں گی!'' ....

اس بار روبی قدرے چیخ کر بولی۔ رحیمہ نے جب بیٹی کی سرخ آنکھوں میں اس کے درد کو بہتے دیکھا تو وہ بھی تڑپ اٹھی۔ ایک وقت تھا جب وہ اپنی بیٹی کے آنکھوں میں ایک نمی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ آج وہ اسکو رولانے کی وجہ بن گئی۔ وہ اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے بولی۔

''بیٹا تجھے کوئی پسند ہے تو بتا دے، میں تیرے ابو سے بات کر کے تیرا رشتہ پکا کر دوں گی۔''

''امی! آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں!!'' روبی کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

''امی مجھے شادی ہی نہیں کرنی۔ اب تو شادی کے نام سے ہی ڈر لگتا ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے ساتھ رہنا ہے بس''

ماں کی ممتا جوار مارنے لگی۔ رحیمہ نے فوراً روبی کو اپنے گلے لگا کر اس کی تمام ذہنی تکلیفوں کو اپنے اندر جذب کرنا چاہا۔ اس نے بڑے پیار سے کہا۔

''روبی ......!! بیٹی کا نکاح ماں باپ پر فرض ہے۔ اب تمھاری پڑھائی بھی مکمل ہو گئی ہے۔ پھر تمھارے ابو کی اور میری صحت بھی اچھی نہیں رہتی۔ دیکھو اللہ کے گھر سے کب بلاوا آ جائے کوئی نہیں جانتا۔ میں اس سے پہلے تمھارا گھر بستا ہوا دیکھنا چاہتی............''

رحیمہ اپنی بات مکمل بھی نہ کر پائی تھی کہ روبی نے فوراً اپنا ہاتھ اپنی امی کے منھ پر رکھ دیا۔

''نہیں نہیں ......امی آپ لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ اللہ آپ دونوں کو سلامت رکھے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر یتیمی کے کرب نظر

آنے لگے۔

رحیمہ اپنی بیٹی کے خوبصورت چہرے پر نمودار الجھن کی آندھیوں کو صاف طور پر دیکھ رہی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''آخر یہ میری بیٹی کو کیا ہوگیا ہے۔''

''کہیں یہ آسیب کا اثر تو نہیں''

روبی نے جیسے جیسے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا ویسے ویسے اس کی خوبصورتی بڑھتی ہی جارہی تھی۔ گلابی آنکھیں، ناگن سے لہراتے گھنے بال، چھریرا بدن، دھوپ سا گورا رنگ، نکلتا قد، اس پر سادگی کی کشش جو کوئی ایک بار دیکھ لے تو اس کا گرویدہ ہو جائے۔ اچھے اچھے گھر سے اس کے لیے رشتے آنے لگے۔ رحیمہ بھی چاہ رہی تھی کہ صحیح وقت پر بیٹی کی شادی کر دے۔ کیونکہ لڑکی کی ڈھلتی عمر کے ساتھ اس کی خوبصورتی ماند پڑنے لگتی ہے۔ پھر اچھا رشتہ ڈھونڈنا وبال جان بن جاتا ہے۔ یوں بھی صورت کے بازار میں سیرت کی اہمیت کون سمجھتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ رحیمہ کئی دنوں سے روبی کو سمجھا رہی تھی کہ وہ کسی رشتے کو 'ہاں' کہہ دے۔ اس بات کو لے کر اکثر ماں بیٹی میں لڑائی ہو جاتی۔ مگر آج رحیمہ اپنی بیٹی کے دل کا حال جان لینا چاہتی تھی۔

''تجھے میری قسم ہے...... اللہ کا واسطہ دیتی ہوں...... کچھ تو بتا کیا ہوا ہے...... مجھے بتا میری بچی! میں ہر حال میں تیرے ساتھ ہوں۔''

ماں کی اس محبت بھرے لاڈ نے روبی کے دل میں جمے لاوے کو پگھلا دیا۔ وہ آتش فشاں جو نہ جانے کب سے اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ اب وہ پھوٹ پڑا۔ اس نے اپنی ماں کی گود میں اپنا سر رکھ دیا، جیسے آج وہ اپنے سارے درد سے نجات حاصل کر لینا چاہ رہی تھی......

روبی نے پیہم آتی اپنی ہچکی روکتے ہوئے کہا۔

''امی آپ کو میرے اسکول کی دوست انجم یاد ہے'' اس نے استفسار کیا۔

''ہاں...... تم دونوں کافی گہری دوست تھی...... اسکول کے بعد تو وہ آسنسول چلی گئی تھی۔''

رحیمہ نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

''جی اور آسنسول جانے کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ مگر...... کچھ دنوں پہلے اس کی امی سے میری ملاقات ہوئی۔''

اچانک روبی خاموش ہوگئی۔ اس کی آنکھیں خالی خالی سی لگنے لگی۔

''کیا ہوا روبی...... انھوں نے تم کو ایسا کچھ کیا کہہ دیا؟......''

رحیمہ اسے قدرے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

''نہیں...... نہیں...... امی، انھوں نے مجھے جو بتایا اس نے میرے ذہن و دل میں طوفان برپا کر دیا ہے۔''

''کیا ہوا..... کچھ صاف صاف بتاؤ تو سہی۔''

روبی رک رک کر بتانے لگی......

''سہی آنٹی جب مجھے ملی تھیں تو وہ کافی پریشان تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ انجم ناری نکیتن میں ہے اور وہ اب وہیں ہاسٹل میں رہتی ہے۔ مجھ سے رہا نہ گیا میں اس سے ملنے ناری نکیتن چلی گئی......''

اچانک روبی چپ ہوگئی، اس کی آنکھیں بتا رہی تھی کہ کئی خوفناک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔

''تو کیا ہوا!...... انجم سے ملاقات ہوئی؟......'' رحیمہ نے تجسس سے پوچھا۔

''ہاں! امی...... لیکن! اب وہ..... وہ انجم نہیں تھی۔''

''کاش میں اس سے پہلے مل چکی ہوتی۔''

رحیمہ فوراً پوچھ بیٹھی

''وہ کیسی ہے؟''

''وہ اپاہج ہو چکی ہے!!......''

روبی کی آنکھوں سے موتی جیسی آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک گئی۔

''اوہ اللہ!...... کیا ہوا تھا اس کے ساتھ............ کوئی حادثہ''

''ہاں امی.... حادثہ...... بڑا حادثہ......''

''کون سا حادثہ ہوا ہے اس کے ساتھ....؟''

''یہ حادثہ، اس کی شادی تھی......''

روبی کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہونے لگے۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر رحیمہ خاموش رہی۔ تھوڑا ٹھہر کر روبی گویا ہوئی۔

''انجم نے مجھے بتایا کہ کس طرح یہاں سے جانے کے بعد اس کے لیے رشتہ آیا۔ اس کے والدین غریب تھے اس لیے فوراً اس رشتے کو غنیمت جان کر کم عمر میں ہی اس کی شادی کر دی۔ شادی کے بعد اس کے سسرال والے اس پر ظلم کرتے مگر وہ اپنے والدین کو کچھ نہیں بتاتی تھی کہ انھیں پریشانی ہوگی۔ دن بہ دن اس کے سسرال والوں کا رویہ بد سے بدتر ہوتا گیا۔ پھر اسے ماں بننے کی خوش خبری ملی۔ اسے امید بندھ گئی کہ اب سارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ زچگی کے لیے اسے اسپتال لے جایا گیا......''

روبی کافی اداس ہوگئی۔

''جانتی ہو امی جب قسمت خراب ہو تب انسان کے ساتھ سب غلط ہی ہوتا ہے...... وہی میری انجم کے ساتھ ہوا۔''

''زچگی کے دوران اسے ایکسپائر انجکشن دیا گیا، اس کے پورے جسم میں زہر پھیل گیا، بیچاری کے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ اسی وقت نیلے پڑ گئے۔

اس کے ظالم سسرال والوں کو اس پر رحم تک نہ آیا وہ اسی حالت میں انجم کو گھر لے آئے۔ تقریباً 15 دن بعد جب انجم کے والد اس سے ملنے آئے تو وہ اس کی حالت دیکھ کر اسے اپنے گھر لے گئے۔ اسپتال لے جانے پر ڈاکٹر اس کے ابو پر کافی ناراض ہوئے! انہوں نے انکل سے کہا...... اتنی دیر لگائی یہاں لانے میں...... بیٹی کو مر ہی جانے دیتے......''

روبی سانس کھینچ کر بولی۔

''بتاؤ امی یہ سن کر ایک باپ پر کیا گزری ہوگی...... ڈاکٹر نے انھیں بتایا کہ انجم کے جسم میں زہر پوری طرح پھیل چکا ہے، اس کا بچنا مشکل ہے۔ اگر بچ بھی گئی تو مجبوراً اس کی دونوں ٹانگیں اور دونوں بازو کاٹنے پڑیں گے۔''

''انجم کے پاپا کتنے غریب ہیں۔ ان کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ اس وقت انجم کو اپنے شوہر کی سب سے زیادہ ضرورت تھی لیکن اس مشکل گھڑی میں اس کے شوہر نے اسے طلاق دے کر اپنا دامن جھاڑ لیا۔ یہی نہیں جس بچے کو اتنی تکلیف سے انجم نے جنم دیا تھا اس کی شکل تک اسے دیکھنے نہیں دی گئی۔ بتاؤ امی انجم پر کیا گزری ہوگی۔ یہ سوچ کر ہی میری روح کانپ جاتی ہے۔''

روبی نے اپنی امی کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

''ماں باپ تو ماں باپ ہوتے ہیں۔ وہ کبھی ہار نہیں مانتے۔ اس کے پاپا نے اسے بہت حوصلہ دیا ان کے پاس جو مال مویشی تھے اسے بیچ کر انجم کا علاج کرایا۔ آخر نوبت یہاں تک آئی کہ اس بیچاری کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی گئیں۔ مگر بازوؤں کو کسی طرح بچا کر انگلیاں کاٹ دی گئیں۔''

روبی کی آنکھیں انجم کے کرب کو محسوس کر کے چھلک رہی تھیں۔

روبی انجم کی روداد اپنی ماں کو بتا کر نہ جانے کیوں خود کو ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ وہ پرسکون انداز میں کہنے لگی:

''آپ کو معلوم ہے امی!!! انجم شروع سے ہی بہت حوصلے والی تھی۔ وہ ماضی کی اذیت کو سینے سے لگا کر جینے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ٹانگوں اور نامکمل ہاتھ کے ساتھ بھی وہ پڑھ لکھ کر اپنے اور اپنے والدین کے لیے کچھ کر سکتی ہے۔ اس لیے اس نے شادی کو ایک برا خواب سمجھ کر بھلا دیا اور کلکتہ کے ناری نکیتن کے ہاسٹل میں آ کر رہنے لگی۔ یہاں آ کر اس نے دوبارہ پڑھائی شروع کی۔ اسکوٹی چلانا سیکھا، کپڑے پر کروشیا سے ڈیزائن بنانا سیکھا۔ میں اس کی ہمت اور ہنر کو سلام کرتی ہوں۔ انجم نے اپنے جذبات کو دل کے ایک صندوق میں بند کر دیا۔ وہ جذبات جو ایک ماں کو اپنے بچے کے لیے ہوتے ہیں۔ وہ بتا رہی تھی کہ شروع میں اسے بہت مشکل ہوئی۔ وہ اپنے بچے کو دیکھنے کے لیے تڑپ جایا کرتی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اسے صبر آتا گیا۔ وہ کہتی ہے کہ اب میں پڑھ لکھ کر کچھ بن جاؤں پھر وہ وقت بھی آئے گا جب میں اپنے بچے کو ان سے واپس لے لوں گی۔ ابھی اس کا پورا دھیان خود کو مضبوط بنانے اور خود کو سنبھالنے میں ہے۔''

تھوڑی دیر کے لیے پورے کمرے میں سکتہ طاری ہو گیا۔ رحیمہ بھی بے چارگی اور بے بسی میں الجھ گئی تھی۔

''اگر ایسا میری بچی کے ساتھ ہوتا تو......'' اور وہ یہ سوچ کر خوف سے کانپنے لگی۔

وہ روبی کی دلی کیفیت کو محسوس کر رہی تھی۔ ماں کو بیٹی کی پیدائش سے ڈر نہیں لگتا بلکہ اس کی قسمت سے لگتا ہے۔ وہ جس کلی کو اپنے خون پسینے سے سینچ کر پھول بناتی ہے، کوئی اور اسے کتنی بے دردی سے کچل دیتا ہے۔ اچانک رحیمہ اپنے ان منفی خیالات کو جھٹک کر اپنی بیٹی کے تابناک مستقبل کے متعلق سوچنے لگی۔ جہاں اس کا ہمسفر ساتھی اس کا ہاتھ تھام کر زندگی کے پیچ وخم سے اسے بچا لے گا۔ یوں بھی ہر مرد یکساں نہیں ہوتا۔ یہاں روبی کے والد جیسے انسان بھی ہیں۔ جس نے مجھے ہمیشہ زندگی کی دھوپ سے شجر سایہ دار کی طرح محفوظ رکھا۔ وہ روبی کو دلاسہ دیتے ہوئے بولیں۔

''ایسا نہیں ہے میری بچی...... دنیا میں سب انجم کے سسرال والوں جیسے نہیں ہیں۔ یہاں کئی گھرانے ایسے ہیں جہاں بہو اور بیٹی میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا...... اپنی اور سہیلیوں کو بھی تو دیکھ وہ اپنے سسرال میں کتنی خوش ہیں۔ تیرے ابو نے ہمیشہ میرا کتنا خیال رکھا۔ ہم تیرے لئے بھی ایسا ہی خاوند تلاش کریں گے جو اچھے شوہر اور اچھے دوست کی طرح تیرا ہمسفر بنے...... ہم پر بھروسہ رکھ...... تیرے ابو تیرے ساتھ کچھ بھی غلط ہونے نہیں دیں گے۔''

ماں کی باتیں سن کر روبی کو کافی حوصلہ ملا۔ وہ کچھ کہہ تو نہ سکی بس حامی میں اپنا سر ہلا دیا۔ لیکن آج ان دونوں کے ذہن میں ایک الگ سی ہلچل مچی تھی۔ زندگی میں کیا ہوگا معلوم نہیں۔ شادی ایک اہم رسم زندگی ہے اسے نبھانی پڑے گی...... پھر اس کے بعد؟؟؟؟......

□□□

Dr. Fatma Khatoon

B-40/8, 3rd Floor, Iron Gate

Garden Reach

Kolkata-700024 (West Bengal)

Mobile:9831726195

Email: fatmakhatoon2809@Gmail.Com

لذیذ پکوان

پاکیزہ نسرین

مٹر پنیر

اجزا:

ایک پاؤ پنیر

ایک پاؤ ٹماٹر

مکسر میں باریک پیسٹ کیے ہوئے ایک کپ تازہ یا بھگوئے ہوئے مٹر

ایک بڑا چمچ ادرک لہسن کا پیسٹ

ایک چھوٹا چمچ گرم مصالحہ

لال مرچ پاؤڈر، نمک حسب ذائقہ

ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا

ایک میڈیم سائز پیاز کٹی ہوئی

تیل دو بڑے چمچے

طریقہ: پنیر کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر ہلکا گلابی تل لیں اور پیاز کو باریک کاٹ لیں۔ ایک پین میں دو بڑے چمچے تیل ڈال کر گرم کرلے۔ اس میں پیاز کو ہلکا گلابی ہونے تک تلے پھر اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال دے۔ اس کو بھی اچھی طرح بھون لیں اب لال مرچ پاؤڈر اور گرم مصالحہ ڈال دیں۔ تھوڑا پکانے کے بعد اس میں مٹر کو ڈال دے اور تھوڑا اور پکالیں۔ اب اس میں ٹماٹر کا پیسٹ ڈال کر اتنا پکائیں کہ وہ تیل چھوڑ دے اور پانی پورا سوکھ جائے۔ اب اس میں پنیر کے ٹکڑوں کو ڈال کر تھوڑا اور بھون کر اس میں دو کپ پانی ڈال کا تیز آنچ پر پانچ منٹ پکائیں اور پھر میڈیم آنچ پر پکنے دیں جب اچھی طرح پک جائے تو اس میں نمک اور باریک کٹا ہوا ہرا دھنیا بھی ڈال دیں اس طرح مٹر پنیر تیار ہے۔

مصالحے دار بینگن

اجزا: 6 عدد بینگن تازے اور چھوٹے گول

ایک بڑا چمچہ ادرک لہسن کا پیسٹ

ایک کپ دہی

گرم مصالحہ، دھنیا پاؤڈر

لال مرچ پاؤڈر

نمک حسب ذائقہ

ہلدی پاؤڈر

طریقہ: بینگن کو اچھی طرح دھو کر صاف کرلیں اور تھوڑا انہیں کٹ مار لے تاکہ وہ تھوڑا کھل جائیں پھر ایک پین میں تیل گرم کرکے اور اس تیل میں تلے ہوئے بینگن کو نکال کر رکھ لیں اب اسی تیل میں ادرک لہسن کا

پیسٹ ڈالیں اس میں لال مرچ پاؤڈر دھنیا پاؤڈر ڈال کر بھونے اس میں پسی ہوئی تلی ڈال دے اچھی طرح بھون کر اس میں ہلدی ڈال دے اور بینگن بھی اس میں ڈال کر بھون لیں اب دہی ڈال دیں اور تیل چھوٹنے تک پکالیں جب تیل چھوٹ جائے تو اس میں تھوڑا سا پانی ڈال دیں جتنی گاڑھی گریوی آپ چاہتی ہیں اتنا پانی ڈال دیں اچھی طرح پکالیں جب پک جائے تو اس میں ہرا دھنیا ڈال دیں اس طرح مسالے دار بینگن تیار ہے۔

ملائی کوفتہ

اجزا:

200 گرام پنیر

200 گرام کسے ہوئے آلو

4 بڑے چمچے میدہ

ایک چھوٹا چمچ گرم مسالہ

تھوڑا چاٹ مسالہ

2 ہری مرچ باریک کٹی ہوئی

ہرا دھنیا باریک کٹا ہوا

نمک حسب ذائقہ

تلنے کے لیے تیل

طریقہ: تمام اجزا کو مکس کر کے اچھی طرح گوندھ لیں۔ گول گول بال بنا کر سوکھے میدے میں تھوڑا اہلائے تیل کو گرم کر کے اچھی طرح گھما گھما کر تیز اور ہلکی آنچ پر تل لیں. کوفتے تیار ہیں۔

گریوی (سالن) کے لیے اجزا:

آدھا کلو گرام پیاز، آدھا کلو گرام ٹماٹر

ایک سندل کا پتہ، چار لونگ دو والا ئچی

تھوڑا زیرا

ایک کپ فریش ملائی

ادرک لہسن کا پیسٹ

کاجو کا پیسٹ

لال مرچ پاؤڈر

گریوی کا طریقہ: ایک پتیلے میں دو بڑے چمچے تیل گرم کر لے اور اس میں زیرا، ادرک۔لہسن کا پیسٹ، کاجو کا پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح بھون لیں اور اس میں ٹماٹر کو پیس کر بنایا ہوا پیسٹ ڈال دیں اور تیل چھوٹنے تک بھون لیں۔ اب ملائی کو مکسر میں گھما لیں۔ بھنے ہوئے گریوی کے مصالحے میں تھوڑا پانی ڈال کر گاڑھی گریوی تیار کر لیں۔ اچھی طرح ملائی ڈال دیں اور نمک ڈال کر 5 منٹ پکالیں۔ گریوی تیار ہے اب اس میں کوفتے ڈال کر ہرا دھنیے سے سجالیں۔

Pakiza Nasreen Syed Salim Ali
Farmanpura, Achalpur City
Taluqa Achalpur
Distt. Amravati-444806 (M.S)

ڈاکٹر احسان رؤف

ایڑی کا درد

ایڑی کا درد جس کو انگریزی میں Heel Pain کہتے ہیں۔ یہ پیر کی ایک عام تکلیف ہے۔ اس صورت میں درد یا تو ایڑی کے پیچھے ہوتا ہے یا ایڑی کے نیچے ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ درد ایڑی کے کنارے یعنی Side میں بھی ہوسکتا ہے۔ یہ درد مرد اور عورت میں عمر کے کسی بھی حصہ میں ہوسکتا ہے۔ ابتداء میں یہ درد دوڑنے، کودنے یا تیز چلنے میں محسوس ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ مثلاً زیادہ وقت تک بیٹھے رہنے یا چلنے پھرنے سے درد زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ درد بہت شدید نہیں ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات یہ مزمن صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اسباب وعلامات (Causes and Symptoms)

1۔ Plantar Fasciitis

ایڑی کا درد اگر ایڑی کے نچلے حصہ میں ہوتا ہے تو اس کا سبب عام طور Plantar Fasciitis ہوتا ہے۔ Plantar Fascia ایک قسم کی جھلی (Membrane) ہے جو ایڑی کی ہڈی (Calcaneum) کو پیر کے نچلے حصہ سے جوڑتی ہے۔ کھڑے رہنے، چلنے دوڑنے اور مختلف کام کرتے وقت ہمارے جسم کا سارا وزن اس کے اوپر رہتا ہے مگر پھر بھی یہ سپاٹ نہیں ہے جب Plantar Fascia پر زیادہ وزن ہوتا ہے، یا اس کا بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے تو اس Fascia میں پھیلاؤ (Streched) ہوجاتا ہے تو اس کے ریشے (Fibers) میں سوجن آجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ایڑی میں درد ہوتا ہے۔

2۔ Achilles tendinitis

Achilles tendon یہ رسی کی طرح ہوتا ہے جو پنڈلی کے عضلات (Calf muscles) کو ایڑی کی ہڈی سے جوڑتا ہے اس کو ایڑی کے پچھلے حصہ میں ہاتھ سے محسوس بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس Tendon میں سوجن کی صورت میں ایڑی کے پچھلے حصہ میں درد ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے پاؤں پیدائشی سپاٹ (چپٹے) ہیں وہ لوگ ان دونوں قسموں کے درد میں زیادہ مبتلا رہتے ہیں۔

3۔ Fracture کبھی ایڑی کی ہڈی میں شدید چوٹ لگنے سے یہ ہڈی ٹوٹ بھی سکتی ہے، جس کی وجہ سے ایڑی میں درد ہوسکتا ہے۔

4۔ موچ یعنی Sprain آنے سے بھی ایڑی میں درد ہوسکتا ہے۔

5۔ بعض مرتبہ سستے قسم کے جوتے یا اونچی ایڑی کی چپل جو سخت ہو اس سے بھی ایڑی کا درد ہوسکتا ہے۔ اس سے بچنے کے لیے اچھے قسم کے گداز اور اسفنج والے جوتوں اور چپل کا استعمال کرنا چاہیے۔

6۔ دیگر اسباب (Other causes)

کچھ لوگوں میں ایڑی کی ہڈی بڑھ جاتی ہے، جس کی وجہ سے ایڑی میں درد ہوسکتا ہے۔ مختلف کھیل کھیلنے والے کھلاڑی مثلاً دوڑنے والے، فٹ بال، والی بال کے کھلاڑی، مختلف قسم کی ورزش کرنے والے افراد یا 8 سے 14 سال کے بچے جو بہت زیادہ کھیل کود یا دوڑ کرتے ہیں ان کی ایڑی میں درد ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ بڑھی ہوئی ہڈی کا پتہ ایڑی کے جوڑ کے X-Ray سے پتہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی خون میں Uric Acid کے بڑھنے کی وجہ سے بھی ایڑی میں درد ہوسکتا ہے اور گٹھیا

(Rheumatoid Arthritis) کی وجہ سے بھی ایڑی میں درد ہوتا ہے لیکن اس صورت میں دوسرے جوڑ بھی مبتلا ہو سکتے ہیں اور ایسے مریضوں میں صبح سو کے اٹھنے کے بعد جوڑوں میں اکڑن (Stiffness) بھی موجود ہوتی ہے۔

تحفظ (Prevention)

ایڑی کے درد سے بچنے کے لیے وزن کو طبعی سے زیادہ نہ بڑھنے دے،،، بہت زیادہ کھیل کود کرنے سے پرہیز کریں۔ اسی طرح اونچی ایڑی کی چپل، سخت جوتے پہننے سے بھی پرہیز کریں۔

علاج (Treatment)

اکثر مریضوں میں Conservative Treatment سے فائدہ ہو جاتا ہے۔ ایڑی کے درد کو مندرجہ ذیل طریقوں سے کم کیا جاسکتا ہے۔

☆ مریض کو آرام کرائیں ،زیادہ چلنے پھرنے اور دیر تک کھڑے رہنے سے پرہیز کرائیں۔

☆ ہلکے درد میں نیم گرم پانی میں لاہوری نمک ڈال کر 10 منٹ تک پانی میں پیر ڈال کر رکھیں۔

☆ درد کش دوائیں (Analegesic) مثلاً Diclofenac Sodium, Ibuprofen, Paracetamol وغیرہ کا استعمال ڈاکٹر کے مشورہ سے کر سکتے ہیں۔ اگر ان دواؤں سے فائدہ نہیں ہوتا ہے تو Corticosteroids injection کا استعمال ڈاکٹر کے مشورہ سے کیا جاتا ہے۔

☆ صبح وشام Streching Exercise کریں۔

یونانی علاج

طب یونانی میں ایڑی کے درد کو وجع العقب کہتے ہیں۔ اس کا علاج ماہر یونانی معالج کے مشورہ سے کر سکتے ہیں۔

☆ حب اسگندھ 2 عدد صبح شام، معجون سورنجان 5 گرام صبح شام استعمال کریں۔ روغن سرخ سے ایڑی کی مالش کریں۔

☆ بابونہ 6 گرام، ناخونہ 6 گرام، گل ٹیسو 6 گرام کو 500 ملی لیٹر پانی میں ابال کر اس پانی میں پیر کو ۱۵ منٹ تک رکھیں۔

☆ دارچینی 12 گرام، جوزبوا 12 گرام، عود صلیب 12 گرام، سورنجان شیریں 24 گرام، صبر سقوطری 24 گرام ان سب دواؤں کا باریک سفوف بنا کر 250 ملی گرام کی گولیاں یا کیپسول بنالیں 2 گولی یا کیپسول رات میں سوتے وقت نیم گرم پانی سے استعمال کریں۔

☆ روغن سرسوں 30 ملی لیٹر، اجوائن 10 گرام، لہسن 10 عدد، اول لہسن کے جوے کو چھلکے سے صاف کر کے روغن سرسوں میں پکالیں جب گہرا بھورا بلکہ سیاہی مائل ہو جائے تو آگ پر سے اتار لیں اور اس گرم تیل میں اجوائن ڈال دیں وہ تیل کی گرمی سے پک جائے گی۔ سیاہ ہو جانے پر روغن تیار ہو جائے گا۔ سرد ہو جانے کے بعد ایڑی کے مقام پر ہلکے ہاتھ سے مالش کریں۔

☆ غذا و پرہیز کے طور پر بادی، ثقیل (مثلاً بیگن، گوبھی) نیز بلغم پیدا کرنے والی ٹھنڈی غذاؤں سے پرہیز کرائیں، جلد ہضم ہونے والی غذا دیں۔

حوالہ جات (References)

1- حکیم شمس الآفاق، وجع المفاصل علاج اور صحت یونانی پیتھی میں، جہان طب سہ ماہی، اپریل۔ جون 2000ء، صفحہ 21-18

2- اسٹینڈرڈ یونانی میڈیکل ٹرمینالوجی، سی سی آر یو ایم، حکومت صحت و خاندانی بہبود، نئی دہلی، 2012، صفحہ 284

3- ڈاکٹر غزالہ یاسمین، ایڑی کا درد اسباب اور احتیاطی تدابیر، سائنس کی دنیا، جنوری۔ مارچ 2022، صفحہ 32-31

4- www.medicalnewstoday.com

5- ٹیبرس سائکلو پیڈک میڈیکل ڈکشنری، 21واں ایڈیشن، ایف اے ڈیوس کمپنی، فلاڈیلفیا، 2009، صفحہ 848

Dr. (Mr.) Ehsan Rauf

476/6C Behind Madeh Ganj

Police Chowki

Sitapur Road

Lucknow-226020 (U.P)

حسن کی نگہداشت

وٹامن ای کی کمی کے خطرناک نقصانات: علامات اور علاج

جس طرح ایک مکان بنانے کے لیے سیمنٹ اور اینٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ایک جسم کی تعمیر کے لیے وٹامنز اور منرلز کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ ہمارے جسم میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ وٹامنز کی کمی کی وجہ سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں جو انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ ہمارے جسم کو وٹامن اے، بی، سی، ڈی اور ای کی ضرورت ہوتی ہے یہ ہمیں مختلف طریقوں سے حاصل ہوتا ہے وٹامن ای کی کمی کو مختلف طریقوں سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ وٹامن ای کی کمی کی وجہ سے ہونے والی علامات اور علاج حسب ذیل ہیں۔

وٹامن ای کی کمی کی علامات

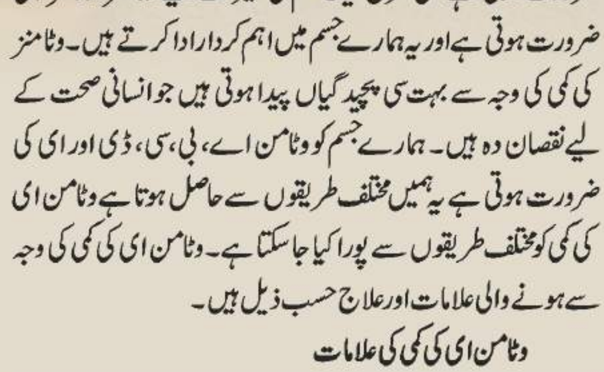

جسم کو کام کرنے کے لیے وٹامن ای کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک ضروری وٹامن ہے جو ہماری جسمانی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ وٹامن ای کی کمی کی علامات مندرجہ ذیل ہیں؛

پٹھوں کی کمزوری: وٹامن ای کی کمی کی وجہ سے ہمیں پٹھوں کی کمزوری ہوتی ہے ہمارے اعصابی نظام کے لیے وٹامن ای بہت ضروری ہے یہ اہم آکسیڈنٹ میں شامل ہے۔ اس کی کمی کی وجہ سے پٹھوں میں تناؤ پیدا ہوتا ہے جو پٹھوں کی کمزوری کا باعث بنتا ہے۔

چلنے میں دشواری: وٹامن ای کی کمی کی وجہ سے پیدل چلنے میں دشواری ہوتی ہے اور جسم میں کمزوری پیدا ہوتی ہے جس وجہ سے انسان پیدل چلنے سے تھک جاتا ہے اور تھکاوٹ محسوس ہوتی ہے۔

نظامِ انہضام کے مسائل: وٹامن ای کی کمی کی وجہ سے ہمارا نظامِ انہضام ٹھیک طریقے سے کام نہیں کرتا۔ وٹامن ای کی کمی ہمارے مدافعتی خلیوں کو روکتی ہے اس لیے بڑی عمر کے لوگوں کو نقصان ہوسکتا ہے۔ اس میں اینٹی آکسیڈنٹ کی خصوصیات شامل ہیں جو آزاد ریڈکلز کے خلاف صلاحیت رکھتے ہیں۔

وٹامن ای کی کمی کا قدرتی علاج: وٹامن ای کی کمی ہمارے لیے نقصان دہ ہے۔ وٹامن ای ہماری جلد کے لیے بہت اہم ہے اس کی کمی دور کرنے کے لیے ہمیں ایسی خوراک استعمال کرنی چاہیے جس میں وٹامن ای کی مقدار پائی جائے۔

وٹامن ای کے ذرائع:

سورج مکھی کے بیج

سورج مکھی کے بیج وٹامن ای کا ذریعہ ہیں لوگ ان کو سلاد کے طور

پر بھی استعمال کرتے ہیں۔سورج مکھی کے بیج ہمارا ہاضمہ درست کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔

بادام کا استعمال

بادام بھی وٹامن ای کا ذریعہ ہیں اس کے علاوہ ان میں آئرن، میگنیشیم اور پروٹین بھی پائی جاتی ہے جو انسانی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔

مونگ پھلی کا استعمال

مونگ پھلی میں بھی وٹامن ای پایا جاتا ہے مونگ پھلی میں 93.4 ملی گرام وٹامن ای پایا جاتا ہے۔

گری دار میوے اور سبزیوں کا تیل

گری میں وٹامن ای پایا جاتا ہے جو انسان کی صحت کے لیے بہت اچھا ہے۔اس کے علاوہ سویابین کا تیل گری کے تیل میں وٹامن ای پایا جاتا ہے جو انسان کی صحت کے لیے اچھا ہے۔

وٹامن ای کا زیادہ استعمال بھی نقصان دہ ہے جو ہمارے لیے خطرناک ہے اس لیے اس کا اعتدال کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے۔اس کے لیے ماہرِ غذائیت سے رابطہ ضروری ہے آپ آسانی سے گھر بیٹھے ماہر غذائیت سے رابطہ کر سکتے ہیں اور وڈیو کنسلٹیشن کے ذریعے مشورہ حاصل کر سکتے ہیں۔

کیا آپ کی جلد پر بھی کالے، بھورے داغ دھبے یا نشان پڑ گئے ہیں؟ جانیے یہ کون سی بیماری ہے اور ڈرماٹولوجسٹ اس کا علاج کیسے کر رہے ہیں؟

ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کا چاند سا روشن چہرہ ہو اور بے داغ چمکتی جلد ہو۔ایسے میں جلد کی بیماریاں جس میں دانے، کیل، مہاسے چھائیاں یا مختلف داغ دھبے شامل ہیں، خواتین کو ڈپریشن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ان ہی بیماریوں میں ایک بیماری میلازما بھی ہے جو کہ چہرے پر بھورے اور سیاہ دھبے ڈال دیتی ہے۔جلد کی ہر بیماری کی کچھ علامات ہوتی ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کون سی بیماری میں مبتلا ہیں۔ لیکن یہ فرق ماہر ڈرماٹولوجسٹ ہی بتا سکتے ہیں کہ مریض کون سی بیماری میں مبتلا ہے۔میلازما کا باقاعدہ ٹیسٹ کیا جاتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے اور پھر اس کا علاج کیا جاتا ہے کہ یہ مرض کون سی قسم کا ہے اور اس میں کیا دوا دی جائے گی اور اس کے علاج میں کتنا عرصہ لگے گا۔

لیکن اگر آپ کو اپنی جلد پر سیاہ یا بھورے داغ دھبے یا نشان نظر آ رہے ہیں تو یہ عموماً میلازما کی علامت ہوتی ہے۔خشک اور بے رونق جلد بھی میلازما کی علامات میں سے ایک ہے۔ ناک، کان کے پیچھے، رخساروں اور ماتھے پر بھورے سیاہ دھبے بھی میلازما کی علامت ہیں۔ سخت گرمی میں جب دھوپ کی سلگتی شعاعیں نازک جلد پر اپنا اثر دکھاتی ہیں تو میلازما ظاہر ہوتا ہے۔ ماں بننے کے دوران ہارمونز کی تبدیلی کی وجہ سے بھی میلازما ہو سکتا ہے۔یہ ہمیشہ دھبوں کی صورت میں ہوتا ہے۔جب آپ کے میلانن کی مقدار غیر متوازن ہوتی ہے تو میلازما ظاہر ہوتا ہے۔

علاج: اس کا علاج مختلف کیمیکل ادویات کی شکل میں کیا جاتا ہے، مرض کی شدت کو دیکھ کر ڈاکٹر علاج تجویز کرتے ہیں۔اب اس میں مختلف وائٹننگ انجیکشنز بھی شامل ہو گئے ہیں، جس کے ذریعے میلازما کا علاج کیا جاتا ہے ان انجیکشنز سے جلد کا دورنگا پن ٹھیک ہوتا ہے، اور جلد کی رنگت صاف ہوتی ہے۔لیکن یہ اپنے معالج سے مشورے کے بغیر استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

(بحوالہ: www.hamariweb.com)

تاثرات: نگر نگر سے

''خواتین دنیا'' ماہنامہ رسالہ جنوری 2022 کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ میگزین خواتین کی تخلیقات پر لکھے جانے والے تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی نوعیت کے مضامین پر مشتمل ہوتی ہے۔اس میں موضوعات کی درجہ بندی خاص طریقہ سے کی جاتی ہے۔اس کے مشمولات کے تعلق سے یہ بات قطعی اور بلا تامل کہی جاسکتی ہے، کہ اس میں بھی قومی کونسل کے دیگر رسائل کی طرح سطحی اور بھرتی کے مضامین کو جگہ نہیں دی جاتی ہے۔جن کے مطالعہ سے طبیعت پر گرانی کے ساتھ وقت کے ضائع ہونے کا احساس ہو۔اچھی بات یہ ہے کہ اس میں نئ اور پرانی نسل کی تحریریں ہوتی ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ اردو کے ایک بڑے سرکاری ادارہ کی سرپرستی میں خواتین دنیا کی ان تخلیقات کی بازیافت ہورہی ہے جو گوشۂ گم نامی میں شیلف لائف پوری کررہی ہیں۔مزید نئ لکھنے والی خواتین کی تخلیقات کے تعلق سے ان کو خاطرخواہ پذیرائی بھی مل رہی ہے۔اردو دنیا کے نئ نسل کے قارئین اور ریسرچ اسکالر بھی ان سے متعارف ہورہے ہیں اور ان کے فن پاروں سے آگاہی حاصل کررہے ہیں۔ یہ رسالہ آغازِ اشاعت سے ہی علمی وادبی حلقہ میں اپنی مقبولیت بنائے ہوئے ہے۔اس کی شہرت و پذیرائی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو قارئین کے حلقہ میں صحیح ادبی ذوق رکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔اس ماہ کے رسالہ کا اداریہ جمہوریت اور خواتین کے مسائل کے متعلق ہے۔جس میں مدیر کی خواتین کے مسائل پر توجہ کا اندازہ ہوتا ہے۔جس میں مدیر، خواتین کو حقوق نسواں اور تعلیم کے تئیں متوجہ کر کے ان کو بااختیار بنانے پر زور دے رہے ہیں۔اس کا اول مضمون معروف اسکالر ڈاکٹر مہتاب جہاں کا ہے ان کا یہ مضمون 'عظیم آباد کی ایک صاحب دیوان شاعرہ جمیلہ خاتون' کے تعلق سے ہے۔جس میں شاعرہ کی شخصیت اور کلام کے سیاق میں خاطرخواہ معلومات پیش کی گئی ہے۔مزید انھوں نے اس مضمون میں ان کے مختصر کلام کے متعلق اپنے تاثرات کا بھرپور اظہار کیا ہے جس سے ڈاکٹر مہتاب جہاں کے تنقیدی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔اس میں ایک مضمون ناچیز کا حجاب امتیاز علی تاج کے ناول 'ظالم محبت' کی رومانوی فکر کے حوالہ سے ہے۔دیگر مضامین میں ڈاکٹر راشد میاں، اشفاق احمد آہنگر، صدف نفیس اور ریحانہ بشیر بڑے علمی اور معلوماتی ہیں جو ان کے مطالعہ اور علمی شعور پر دال ہیں۔اعتراف ہنر کے حصہ میں ڈاکٹر واحد نظیر کا 'فکری توازن کی نمائندہ شاعرہ: رفعیہ شبنم عابدی' ایک بہت ہی متوازن تجزیاتی مضمون ہے جس میں ان کی تحریری اور تنقیدی فہم ابھر کر سامنے آتی ہے۔آسیہ یاسمین نے معروف مصنفہ 'رینو بہل بحیثیت ناول نگار' کے عنوان سے ان کے تین ناول، 'گرد میں اٹے چہرے'، 'میرے ہونے میں کیا برائی ہے' اور 'نجات دہندہ' میں پیش کیے گئے نفس مضمون کو بڑی خوبصورتی سے متعارف کرایا ہے۔حسن سخن میں مسرور صغریٰ کی خوبصورت غزل، تنہا ردیف، میں شائع ہوئی ہے۔آبگینہ عارف کی دو نظمیں 'میرا ہونا کیا ہے؟' اور 'محبت' ہے۔ایک میں انسانی ہستی کی آسودگی اور دوسری میں بے لوث محبت کا احساس نمایاں طور پر ابھرتا ہے۔شازیہ نیازی کی دو عمدہ غزلیں ہیں۔نزہت نبیلہ کی 'ذمہ دار کون' اور ڈاکٹر نغمہ جاوید کی 'روشنی کے سائے' دونوں کہانیاں نفس مضمون کے اعتبار سے اچھی ہیں جو ان کے تخلیقی مزاج وشعور کی غماز ہیں۔لذیذ پکوان، حسن کی نگہداشت دونوں مضمون معلوماتی ہیں۔'سن بلوغت' کے حوالہ سے ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی کا مضمون قابل تحسین اور لائق مطالعہ ہے۔

ڈاکٹر سرفراز جاوید، بٹلہ ہاؤس، نئ دہلی)

آج کی خواتین ادب کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں: پروفیسر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں مشہور افسانہ نگار غزالہ قمر اعجاز کے افسانوی مجموعہ ''مجھے بھی'' کا اجرا کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد اور دیگر مہمانوں کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر عقیل احمد نے مصنفہ کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ ایک زمانہ تھا جب خواتین کی تخلیقات کم منظر عام پر آتی تھیں اور انھیں اس راہ میں دشواریاں درپیش تھیں، مگر اب عورتیں کسی بھی میدان اور کسی بھی شعبے میں مردوں سے کمتر اور پیچھے نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آج نسائی اور تانیثی تحریک کے زیر اثر بہت سی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں، جن میں عام سماجی معاملات کے علاوہ خالص خواتین سے متعلق موضوعات کا بھی احاطہ کیا جارہا ہے۔ شیخ عقیل نے کہا کہ غزالہ قمر اعجاز کے افسانے بہت عمدہ ہیں اور انھوں نے تمام سماجی پہلوؤں کو اپنی تخلیقات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، فنی اعتبار سے بھی انھوں نے افسانے کے تمام لوازمات وشعریات کو ملحوظ رکھا ہے، ان کی زبان بھی رواں اور سادہ ہے۔

معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی نے کہا کہ غزالہ قمر نئے عہد کی تخلیق کار ہیں اس لیے انھیں نئے سماجی وادبی تقاضوں کا ادراک ہے اور ان کا اسلوب بیان بھی دلکش ہے۔ ان کے افسانوں میں سماجی نفسیات کا زاویہ بہت اہم ہے، انھوں نے فرد اور سماج کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اسی کا اظہار اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔

ڈاکٹر نعیمہ جعفری نے کہا کہ غزالہ تانیثیت کی ایک معتبر آواز کے طور پر اپنی شناخت رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کے مسائل اور درد کو بیان کیا ہے۔

معروف افسانہ نگار اور نسائی ادبی تنظیم 'بنات' کی سربراہ ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ غزالہ بے حد حساس خاتون ہیں اور اس کا اثر ان کی کہانیوں میں بھی پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف رامپوری نے غزالہ قمر کے افسانے 'سرگوشی' کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں انھوں نے بدلتے ہوئے سماجی منظرنامے کا بہ خوبی نقشہ کھینچا ہے۔ سرگوشی میں انھوں نے خواتین کے حوالے سے بدلتے ہوئے انفرادی وسماجی خیالات وتصورات کی نشان دہی کی ہے۔

'بیسویں صدی' کی مدیرہ شمع افروز زیدی نے بھی غزالہ قمر کے تخلیقی امتیازات اور فنی کمالات کی نشان دہی کی۔

ان کے علاوہ مشہور افسانہ نگار رخشندہ روحی، پروفیسر ممتاز احمد، چشمہ فاروقی اور سفینہ نے بھی افسانوی مجموعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے مصنفہ کو مبارکباد پیش کی۔ غزالہ قمر اعجاز نے کتاب کے تعلق سے مختصر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اس مجموعے میں چھبیس افسانے ہیں جو آج کے حالات وواقعات کی عکاسی کرتے ہیں۔ آخر میں غزالہ قمر اعجاز کے شوہر اعجاز عالم نے کتاب پر اظہار خیال کرنے والے تمام مہمانوں اور کتاب کی رونمائی کے لیے ایک موقر پلیٹ فارم مہیا کرنے پر اردو کونسل کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد کا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کونسل کا تمام عملہ موجود رہا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 مارچ، 2022

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم

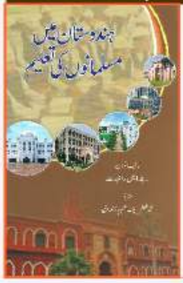

ترتیب و تدوین: جے ایس راجپوت

مترجم: محمد غطریف شہباز ندوی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 484، قیمت 245 روپے

مغربی تعلیم اور مسلمان

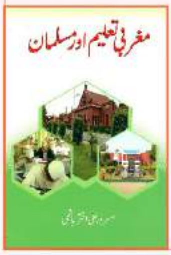

مصنف و مترجم: مسرور علی اختر ہاشمی

دوسری اشاعت: 2021

صفحات: 240

قیمت: 130 روپے

دیوان داراشکوہ

مترجم: شاہد نوخیز اعظمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 208

قیمت: 125 روپے

علم البیان: اقسام نثر و نظم

مصنف: ثروت میرٹھی، مرتب: نگار عظیم

پہلی طباعت: 2021

صفحات: 258

قیمت: 140 روپے

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

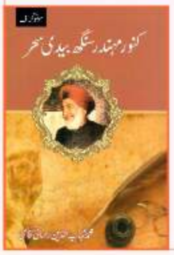

مصنف: محمد شہاب الدین رحمانی قاسمی

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 135

قیمت: 85 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر و ترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

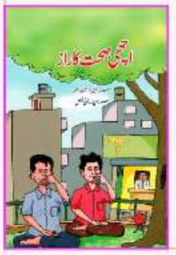

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, मार्च –२०२२ वर्ष:६ , अंक: ३

Mahnama Khawateen Duniya Monthly March 2022, Vol.6 , Issue: 3

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education , Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026

DL (S)-17/3555/2021-23

ISSN 2581-4826

Date of Publication: 13-03-2022

Date of Dispatch : 14 and 15 of every month

Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

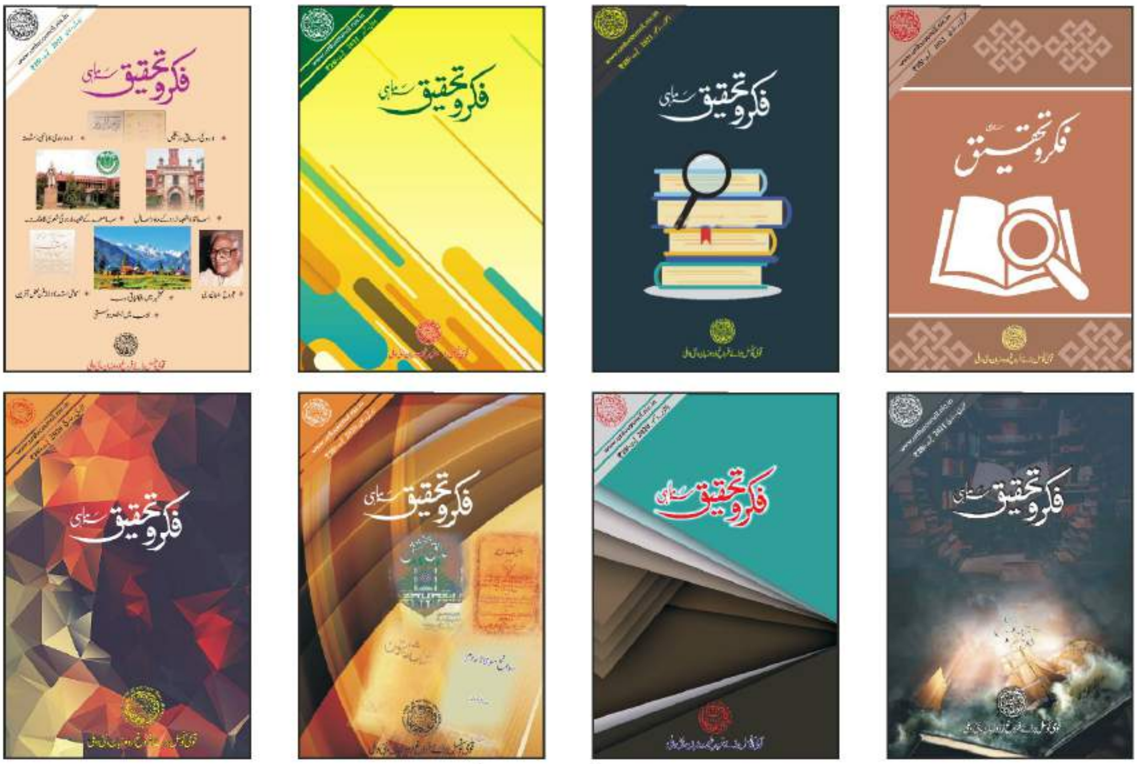

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے

مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159 ، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020 And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6